أَفْضَلُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرآنَ وَعَلَّمَهُ

"تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن حکیم سیکھے اور سکھائے" (صحیح بخاری)

جید قراء کرام کی آواز میں تلاوتِ قُرآن
مستند اُردو ترجمہ کے ساتھ تفہیمِ قُرآن

ماہِ رمضان کی بابرکت ساعتوں میں اپنی ساعتوں کو تلاوتِ کلامِ مجید سے بہرہ ور کرنے کیلئے ریڈیو پاکستان کے

ایف ایم چینل **93.4 "صوتُ القرآن"** کو ٹیون کریں یا اپنے موبائل فون پر ریڈیو ایپ **ریڈیو پاکستان آفیشل** ڈاؤن لوڈ کرنے کے بعد لائیو سٹریم کے ذریعے اس چینل کی نشریات سُنیں

الحمدللہ!

ملک کے ساٹھ شہروں اسلام آباد، لاہور، کوئٹہ، ملتان، فیصل آباد، نارووال، بہاولپور، حیدر آباد، خیر پور، مٹھی، گلگت، سکردو، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان، گوادر، سبی، میر پور، پشاور، کراچی اور دیگر شہروں میں "صوتُ القرآن" کی یہ نشریات **2015** سے جاری ہیں

اِن شاء اللہ

ریڈیو پاکستان، وزارتِ اطلاعات و نشریات
حکومتِ پاکستان

ماہنامہ

آہنگ

۱۹۴۸ء سے مسلسل اشاعت

ستمبر 2026ء



وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کی کرغزستان کے دارالحکومت بشکیک میں شنگھائی تعاون تنظیم کے سربراہی اجلاس میں آمد کے بعد عالمی رہنماؤں کے ساتھ گروپ فوٹو

اداریہ

ستمبر آتے ہی موسم اپنے تیور بدلنے لگتا ہے۔ گرمی کی شدت میں کمی، ہواؤں میں اُترتی خنکی اور سردیوں کی آمد کی ابتدائی چاپ ایک نئے موسم کا احساس دلاتی ہے، مگر پاکستان کے لیے ستمبر محض موسم کی تبدیلی کا مہینہ نہیں، یہ قومی عزم، دفاعِ وطن اور قربانی کی انمٹ یادوں کو تازہ کرنے کا مہینہ بھی ہے۔6 ستمبر کا دن ہمیں اُن عظیم شہداء اور غازیوں کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے وطن کی آزادی، سلامتی اور خود مختاری کے تحفظ کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ یہ دن ہمیں صرف ماضی یاد نہیں دلاتا بلکہ یہ سبق بھی دیتا ہے کہ وطن کی حفاظت کا جذبہ ہر دور میں قومی اتحاد، ذمہ داری اور تعمیر و ترقی کے عزم سے جُڑا رہتا ہے۔آج اِسی قومی عزم کو اَمن، ترقی اور خوشحالی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کا بشکیک میں شنگھائی تعاون تنظیم کے اجلاس سے خطاب بھی اِسی وسیع تر تصور کی ترجمانی کرتا ہے کہ علاقائی تعاون اور مشترکہ ترقی کے ذریعے خطے میں امن و خوش حالی کی راہیں ہموار کی جائیں۔ جنہوں نے وطن کے دفاع کے لیے قربانی دی، اُن کی جدوجہد کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم ایک مضبوط، پُرامن، ترقی یافتہ اور خوش حال پاکستان کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کریں۔ دفاعِ وطن ہو یا تعمیرِ وطن، دونوں کے لیے اتحاد، اخلاص، محنت اور قومی ذمہ داری ناگزیر ہیں۔اِس قومی احساس کو بیدار رکھنے اور اہم قومی مواقع کو عوام تک مؤثر انداز میں پہنچانے میں ریڈیو پاکستان بھی اپنی ذمہ داری نبھاتا آیا ہے۔یومِ دفاع و شہداء کے موقع پر اِس کی خصوصی نشریات، شہداء اور غازیوں کو خراجِ عقیدت اور قومی موضوعات پر خصوصی پروگرام اِسی قومی فریضے کا تسلسل ہیں۔

اللہ تعالی پاکستان کو ہمیشہ امن، استحکام، ترقی اور خوش حالی عطا فرمائے، ہمارے شہداء کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں وطن کی سلامتی، سربُلندی اور تعمیر و ترقی کے لیے اخلاص کے ساتھ اپنا کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

سربراہِ اعلیٰ
اشفاق احمد خلیل

نگرانِ اعلیٰ
سعید احمد شیخ

نگران
عمران جاوید

مدیرِ اعلیٰ
افشاں نگار

مدیر
انیس الرحمن

کمپوزنگ
رابعہ شبیر احمد

گرافک ڈیزائننگ
عمران جوہر

قیمت:500روپے

ماہنامہ آہنگ ستمبر 2026ء

☆عزمِ نو۔۔۔

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کی کرغزستان کے دارالحکومت بشکیک میں شنگھائی تعاون تنظیم کے سربراہانِ مملکت کی کونسل کے اجلاس سے خطاب پر مبنی رپورٹ — رپورٹ غضنفر عزیز — 3

کُل پاکستان سالانہ مقابلۂ نعت خوانی2026ء — رپورٹ: زنیرہ سلمان — 5

میگا آزادی شو2026ء سبز ہٰ جمال ہے، یہ خطۂ کمال — رپورٹ: کامران طارق — 6

☆مضامین۔۔۔۔

یومِ فضائیہ، شاہینوں کی لازوال داستان — تحریر: ممتاز عارف — 8

بارود، جوشیر شاہ سوری کی کامیابی اور موت دونوں کی وجہ بنا — تحریر: سعید احمد شیخ — 9

دُنیا ہے کتاب اندر — تحریر: شیخ محمد ارشد — 11

خوشگوار ستمبر اور موسمیاتی تبدیلی — تحریر: خوش بخت شیریں — 12

☆دانشور۔۔۔۔

اختر شیرانی، شاعرِ رومان کی خوابناک دُنیا — تحریر: ڈاکٹر طارق ہاشمی — 14

ڈاکٹر وزیر آغا، ایک ہمہ جہت شخصیت — تحریر: یوسف خالد — 16

داستان گو اشفاق احمد — تحریر: ریاض محمود — 19

☆اُردو ادب۔۔۔۔

موسم بالکل صاف تھا (انشائیہ) — تحریر: شاہد اللہ خان — 21

خواب (ریڈیو کالم) — تحریر: افضل خان — 23

☆تہذیب و ثقافت۔۔۔۔

سنگِ سیاہ، بلوچستان کی تاریخ و ثقافت — ڈاکٹر عابد میر — 24

سیاحت اور ہماری ذمہ داری — فاکہہ قمر — 26

☆فن اور فنکار۔۔۔

امر گیت نگار، احمد راہی — تحریر: محمد ظہیر بدر — 27

اُستاد امانت علی خان، کب آؤ گے موراتم بن جیار اُداس — پروفیسر سلیم الرحمٰن — 28

ڈرامے کی سنہری روایت کا پاسدار، عابد علی — تحریر: خرم سہیل — 31

☆ہم تو آواز ہیں۔۔۔۔

ریڈیو پاکستان گلگت میں محفلِ مدحتِ مصطفیٰ کا انعقاد — رپورٹ: ڈاکٹر شیر دل خان — 32

یومِ آزادی: مزارِ قائد پر تبدیلی گارڈ کی تقریب — رپورٹ: الطاف احمد لغاری — 33

ریڈیو پاکستان گلگت میں یومِ آزادی کی خصوصی تقریب — رپورٹ: واجد علی — 34

محترمہ خان بی بی کا ریڈیو پاکستان گلگت کا تفصیلی دورہ — رپورٹ: ڈاکٹر شیر دل خان — 35

ریڈیو پاکستان فیصل آباد کا 44سالہ نشریاتی سفر — تحریر: ثناء ریاض — 36

شعبہ میڈیا اینڈ کمیونی کیشن اسٹڈیز اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے طلباء و طالبات کا مطالعاتی دورہ اور تربیتی سیشن کا انعقاد — رپورٹ: فیض رسول ہاشمی — 37

☆اسپورٹس۔۔۔۔

انیس الرحمان — 38

☆بچوں کا آہنگ۔۔۔۔۔

میں پاکستان ہوں — تحریر: ریحانہ کوثر سلہری — 39

☆ستمبر کے اہم دن۔۔۔۔۔ — 40



وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف کی کرغزستان کے دارالحکومت بشکیک میں شنگھائی تعاون تنظیم کے سربراہانِ مملکت کی کونسل کے اجلاس سے خطاب پر مبنی رپورٹ

رپورٹ غضنفر عزیز

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے کرغزستان کے دارالحکومت بشکیک میں شنگھائی تعاون تنظیم کے سربراہانِ مملکت کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان بین الاقوامی قانون کے تحت تنازعات کے پُرامن حل کے لیے پُرعزم ہے اور اقوامِ متحدہ اور شنگھائی تعاون تنظیم کے منشور پر پوری طرح کاربند ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ پاکستان نے ایسے وقت میں بھرپور انداز میں اَمن کی حمایت کی جب رواں سال کے آغاز میں شنگھائی تعاون تنظیم کے ایک رُکن ملک کی خود مختاری اور علاقائی سالمیت کی خلاف ورزی کی گئی جس سے خطے میں ایک بڑا بحران پیدا ہوا اور پاکستان نے اِس مشکل وقت میں مستقل طور پر ایک ایماندار، مخلص ثالث اور سہولت کار کے طور پر کام کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ پاکستان کی مسلسل سفارتی کوششیں خطے میں کشیدگی کم کرنے اور اَمن کی بحالی کے لیے اسلام آباد مفاہمتی یادداشت پر دستخط کی صورت میں کامیاب ہوئیں۔

مکہ مشترکہ دفاعی معاہدے پر دستخط کا حوالہ دیتے ہوئے وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے کہا کہ یہ بنیادی طور پر دفاعی نوعیت کا معاہدہ ہے جو کسی بھی ملک کے خلاف نہیں اور نہ ہی اِس کا مقصد کسی قسم کی محاذ آرائی یا تقسیم پیدا کرنا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی قربانیوں کو اُجاگر کرتے ہوئے وزیراعظم نے کہا کہ گزشتہ ڈھائی دہائیوں کے دوران دہشتگردی کے خلاف جنگ میں پاکستان نے 90 ہزار سے زائد جانوں کی قربانی دی اور ایک سو پچاس ارب ڈالر سے زائد کا معاشی نقصان برداشت کیا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ پاکستان ایک پُرامن، مستحکم اور خوشحال افغانستان کا خواہاں ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ جب تک دہشتگرد افغان سرزمین کو بے گناہ پاکستانی اور دیگر شہریوں کا خون بہانے کے لیے استعمال کرتے رہیں گے اُس وقت تک پائیدار اَمن کا حصول ممکن نہیں ہوگا۔ شنگھائی تعاون تنظیم کے رُکن ممالک کے درمیان تعاون کی امکانات کو اُجاگر کرتے ہوئے اُنہوں نے علاقائی رابطوں کو خوشحالی کے لیے اہم قرار دیا۔

وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف اور دیگر رہنماؤں نے شنگھائی تعاون تنظیم کے اجلاس کے مشترکہ اعلامیہ پر بھی دستخط کیے۔ اُنہوں نے شنگھائی تعاون تنظیم کی حقیقی صلاحیت سے استفادے کے لیے پاکستان کے پختہ عزم کا اعادہ کیا اور اُنہوں نے انفارمیشن ٹیکنالوجی، مصنوعی ذہانت، توانائی کی پیداوار اور غربت میں کمی، قدرتی آفات کے اثرات سے نمٹنے کے لیے گورننس، صحت، ثقافت اور کھیلوں کے شعبوں کو ترجیح دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ اُنہوں نے شنگھائی تعاون تنظیم کو نئی بلندیوں پر لے جانے کے لیے بھرپور کوششوں پر زور دیا۔ وزیراعظم نے دہشتگردی کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے



کہا کہ پاکستان دہشتگردی، علیحدگی پسندی اور مذہبی انتہاپسندی سے نمٹنے کے لیے شنگھائی تعاون تنظیم کی انسدادِ دہشت گردی کے علاقائی ڈھانچے کے تحت مشترکہ مقاصد آگے بڑھانے کے لیے مکمل طور پر پُرعزم ہے۔ اُنہوں نے پانی کی اہمیت اُجاگر کرتے ہوئے کہا کہ یہ خطے کی بنیادی ضرورت ہے کیونکہ یہ لاکھوں لوگوں کی زندگیوں کی بقاء، زمینوں کو سیراب کرنے اور آنے والی نسلوں کے محفوظ مستقبل کے لیے ناگزیر ہے۔ مزید یہ بھی کہا کہ پانی کو کبھی ہتھیار یا سیاسی دباؤ کے ذریعے کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ اُنہوں نے کہا کہ مشترکہ پانی سے متعلق معاہدوں پر ہر حال میں عمل درآمد ہونا چاہیے اور اُن کی مکمل پاسداری ہر حال میں ضروری ہے۔ وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے شرکاء کو شنگھائی تعاون تنظیم پلس کے آئندہ اجلاس میں شرکت کی دعوت بھی دی جو اگلے سال اسلام آباد میں منعقد ہوگا۔ پاکستان نے اگلے سال کے لیے شنگھائی تعاون تنظیم کی صدارت بھی سنبھال لی ہے۔ سماجی رابطے کی ویب سائٹ ایکس پر ایک پوسٹ میں وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے کہا کہ پاکستان اپنے دورِ صدارت میں عمل، روابط کے فروغ، جدت اور مشترکہ خوشحالی کے وژن کے تحت کام کرے گا۔ اُنہوں نے سربراہی اجلاس کے کامیاب انعقاد اور تنظیم کو منفرد انداز میں چلانے پر جمہوریہ کرغزستان کی حکومت کو بھی مبارکباد دی۔ وزیراعظم جناب محمد شہباز شریف نے اِس اعتماد کا اظہار کیا کہ ایس سی او (SCO) بھرپور طاقت کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے خطے کے تین ارب لوگوں کی زندگیوں میں حقیقی بہتری لائے گی۔

بشکریہ نیوز اینڈ کرنٹ افیئرز چینل





کُل پاکستان سالانہ مقابلۂ نعت خوانی2026ء

رپورٹ: زنیرہ سلمان





ماہِ ربیع الاول وہ ماہِ پُر نور ہے جس میں اللہ رب العزت نے اپنے محبوب محمد مصطفیٰ ﷺ کو دنیا میں مبعوث فرما کر انسانیت پر عظیم احسان فرمایا۔ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے جہالت کے اندھیرے چھٹ گئے اور انسانیت کو ہدایت، محبت، عدل اور امن کی روشنی نصیب ہوئی۔

ہر ابتدا سے پہلے، ہر انتہا کے بعد

ذاتِ نبی بُلند ہے، ذاتِ خدا کے بعد

ربیع الاول کا مہینہ تمام مسلمانانِ عالم کے لیے انتہائی مقدس اور اہمیت کا حامل ہے۔ یہی وہ ماہِ مبارک ہے جو آمدِ مصطفیٰ ﷺ کی نوید سناتا ہے اور پورے ملک میں جشن اور محافلِ نعت کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اِس بابرکت موقع پر پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن اور پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کے باہمی اشتراک سے 20 اگست 2026ء کو پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس اسلام آباد کے آڈیٹوریم میں 41واں کُل پاکستان سالانہ مقابلۂ نعت خوانی کی تقریب منعقد ہوئی۔ اِس بابرکت تقریب کے مہمانِ خصوصی وفاقی وزیر برائے مذہبی امور و بین المذاہب ہم آہنگی جناب سردار یوسف تھے اور شرکاء میں ڈائریکٹر جنرل پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن جناب سعید احمد شیخ، جنرل منیجر پاکستان ٹیلی ویژن جناب سہیل اشرف، محترمہ مسرت شاہ رخ ڈائریکٹر پروگرامز اور اسٹیشن ڈائریکٹر جناب عمران جاوید شامل تھے۔

قومی سطح کی اِس تقریب میں چاروں صوبوں بشمول گلگت بلتستان، آزاد کشمیر اور وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کے صوبائی مقابلوں میں اول آنے والے نعت خوانوں نے حصہ لیا اور بارگاہِ رسالت ﷺ میں ہدیۂ نعت پیش کیا۔ اِس مقابلۂ نعت خوانی کے منصفین کے فرائض معروف نعت خواں نُور محمد جرال (صدارتی تمغہ برائے حُسنِ کارکردگی)، قاری اکرام اللہ محسن (تمغۂ امتیاز اور مصر کی معروف درسگاہ جامعہ الازہر سے اعزازی ڈگری کے حامل) اور وقار حسین مدنی (معروف نعت خواں) نے انجام دیے۔

یہ سالانہ کُل پاکستان مقابلۂ نعت خوانی چار مراحل پر مشتمل تھا۔ پہلے مرحلے میں 15 برس سے کم عمر لڑکے اور دوسرے مرحلے میں پندرہ برس سے کم عمر لڑکیوں نے نعتِ رسول ﷺ پیش کی جبکہ تیسرے اور چوتھے مرحلے میں 15 سے 25 سال کے لڑکوں اور لڑکیوں نے نبی کریم ﷺ کے حضور ہدیۂ نعت پیش کیا۔



پندرہ سال سے کم عمر لڑکوں میں سید احمد علی شاہ نے خیبر پختونخواہ سے تیسری، محمد فیضان (بلوچستان) نے دوسری اور محمد طلحہ ہاشمی (اسلام آباد) نے پہلی پوزیشن حاصل کی اور دوسرے مرحلے میں 15 برس سے کم عمر لڑکیوں میں کنزہ رزاق (پنجاب) نے تیسری، سکینہ بتول (اسلام آباد) نے دوسری اور حورین فاطمہ (خیبر پختونخواہ) نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ 15 برس سے زائد اور 25 برس سے کم عمر لڑکوں میں سید حسان علی شاہ (سندھ) نے تیسری، حمزہ اشرف (اسلام آباد) نے دوسری اور علی زین (پنجاب) نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اِسی طرح چوتھے اور آخری مرحلے میں 15 برس سے زائد اور 25 برس سے کم عمر لڑکیوں میں، پنجاب کی عائشہ بی بی تیسری، خیبر پختونخواہ کی اریبہ غلام نبی نے دوسری اور سندھ سے تعلق رکھنے والی تنزیلہ پہلے نمبر پر رہیں۔

کُل پاکستان مقابلۂ نعت خوانی میں پہلی پوزیشن لینے والوں کو ایک لاکھ، دوسری پوزیشن لینے والے نعت خوانوں کو 75 ہزار، جبکہ تیسری پوزیشن کے حامل افراد کو 50 ہزار نقد انعام دیا گیا جبکہ حوصلہ افزائی کے لیے باقی رہ جانے تمام نعت خوانوں کو 25 ہزار روپے نقد انعام دیا گیا۔

وفاقی وزیر برائے مذہبی امور و بین المذاہب ہم آہنگی جناب سردار محمد یوسف نے پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن اور پاکستان ٹیلی ویژن کو اِس پُر وقار تقریب کے انعقاد پر مبارکباد پیش کی۔ اُنہوں نے کہا کہ ہمیں بالخصوص نوجوانوں میں عشقِ رسول ﷺ کو اُجاگر کرنے اور اپنی دینی اور قومی روایات کو نئی نوجوان نسل میں منتقل کرنا ہے۔ رسول ﷺ کی زندگی ہم سب کے لیے کامل نمونۂ حیات ہے۔ محبت، رحم، برداشت، اخوت، انسانیت، باہمی احترام آج کی اہم ضرورت ہے۔ اُنہوں نے مزید کہا کہ ہمیں چاہیے کہ ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کریں اور رسول ﷺ کی تعلیمات کو اپنی زندگیوں میں شامل کریں۔

ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جناب سعید احمد شیخ نے آنے والے تمام مہمانانِ گرامی بالخصوص نوجوان نعت خواں بچوں کو خراجِ تحسین پیش کیا اور تقریب میں بصارت سے محروم دو بچوں کی خصوصی طور پر حوصلہ افزائی کی جنہوں نے مقابلے میں حصہ لے کر سچے عاشقِ رسول ﷺ ہونے کا ثبوت دیا۔

بشکریہ پی بی سی اسلام آباد

سبزہ جمال ہے، یہ خطۂ کمال

میگا آزادی شو 2026ء

جشنِ آزادی: ایک شام جو وطن کے نام رہی

رپورٹ: کامران طارق



پاکستان کے 79 ویں یومِ آزادی کی مناسبت سے ریڈیو پاکستان اسلام آباد کے مہدی حسن آڈیٹوریم میں ایک ایسی شام سجائی گئی جس نے جشنِ آزادی کے جذبے کو تاریخ، قربانی، ذمہ داری، قومی یکجہتی، ثقافتی رنگا رنگی، خدمتِ انسانیت اور پاک آذر بائیجان دوستی کی مالا میں پُرو دیا۔

"سبزہ جمال ہے، یہ خطۂ کمال: میگا آزادی شو 2026" کے عنوان سے منعقد ہونے والی یہ تقریب محض ایک محفل نہیں بلکہ جذبۂ حبُ الوطنی کا ایک زندہ استعارہ بن گئی۔

تقریب کا سماں اُس وقت اور بھی پُر وقار ہو گیا جب محفل کا آغاز قومی ترانے کی دُھن سے ہوا اور حاضرین احتراماً کھڑے ہو گئے گویا ہر دل ایک ہی لَے میں دھڑک رہا ہو۔

ڈائریکٹر پروگرامز ریڈیو پاکستان محترمہ مسرت شاہ رخ نے اظہارِ تشکر میں کہا کہ 14 اگست کیلنڈر کے اوراق میں چھپی ایک عام تاریخ نہیں بلکہ لہو رنگ قربانیوں کی وہ لازوال داستان ہے جس کے طفیل پاکستان نے دنیا کے نقشے پر بحیثیت ایک آزاد و خود مختار ریاست جنم لیا۔ اُنہوں نے کہا کہ آزادی محض شادمانی کا پیغام نہیں دیتی بلکہ ہر شہری کے کندھوں پر ذمہ داری کی ایک امانت بھی رکھ دیتی ہے جسے نبھانا ہر پاکستانی پر فرض ہے۔ اسلام آباد کو ملک کے حسین دارالحکومت کے طور پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اُنہوں نے نہایت خوبصورت پیرائے میں کہا کہ کسی شہر کی اصل زیبائش بلند و بالا عمارتوں یا کشادہ شاہراہوں میں نہیں بلکہ اُس کے باسیوں کے شعور، صفائی سے محبت، شجر کاری کے جذبے اور ماحول کی حفاظت میں پنہاں ہوتی ہے۔ اسلام آباد کی سرسبزی و شادابی اور بحالی میں کردار ادا کرنے والوں کو بھی خصوصی طور پر سراہا گیا۔

ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان جناب سعید احمد شیخ نے معزز مہمانانِ گرامی کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یومِ آزادی صرف محبتِ وطن کا سبق نہیں دیتا بلکہ تعمیر و ترقی میں انفرادی و اجتماعی کردار ادا کرنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اُنہوں نے اِس یادگار شب کے انعقاد پر ریڈیو پاکستان اسلام آباد کی محنتی ٹیم کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا۔



وفاقی سیکرٹری برائے اطلاعات و نشریات جناب اشفاق احمد خلیل نے آزادی کو "عظیم قومی نعمت" قرار دیتے ہوئے کہا کہ قیامِ پاکستان کی خاطر دی جانے والی بے شمار قربانیوں کا حق ادائیگی تبھی ممکن ہے جب ہر شہری اپنے فرائض دیانت، خلوص اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ نبھائے۔ نوجوانوں کو ملک کا روشن مستقبل قرار دیتے ہوئے اُنہوں نے کہا کہ اُن کی تعلیم، ہنر اور مثبت فکر ہی تعمیرِ وطن کی اصل بنیاد ہیں۔



آذر بائیجان کے سفیر جناب خضر فرہادوف نے پاکستانی قوم کو یومِ آزادی کی مبارکباد دیتے ہوئے دونوں ممالک کے تعلقات کو دو برادر اقوام کے دیرینہ اور دلی رشتے سے تشبیہ دی اور دو طرفہ تعاون کو مزید مستحکم بنانے کے عزم کا اظہار کیا۔ باکو کی شہری خوبصورتی سے متاثر ہو کر اسلام آباد میں جاری تزئین و آرائش کے منصوبوں کو پاک آذر بائیجان دوستی کی عملی و روشن مثال قرار دیا گیا۔

میجر جنرل (ریٹائرڈ) پروفیسر جناب ڈاکٹر پرویز احمد، ہلالِ امتیاز (ملٹری) نے اپنے پُر مغز خطاب میں قومی خدمت کو خدمتِ انسانیت سے جوڑتے ہوئے تھیلیسیمیا اور خون کے سرطان میں مبتلا مریضوں کے لیے اپنی فلاحی کاوشوں کا ذکر کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ وطن کی خدمت صرف سرحدوں کے دفاع تک محدود نہیں بلکہ کسی کی جان بچانا، کسی بچے کو تعلیم سے روشناس کرانا اور کسی ضرورت مند کی مشکل آسان کرنا بھی اِسی عظیم عمارتِ وطن کی اینٹ ہے۔

تقریب کا حُسن اُس وقت مزید نکھر اُٹھا جب خیبر پختونخوا، سندھ، پنجاب، بلوچستان، گلگت بلتستان اور کشمیر کی ثقافتی رنگا رنگی نے اسٹیج پر جان ڈال دی۔ رقص، موسیقی اور روایتی لباس کے امتزاج نے یہ پیغام دیا کہ پاکستان مختلف زبانوں اور روایات کا حسین گلدستہ ہے جہاں ہر رنگ اپنی جگہ منفرد مگر مشترکہ شناخت میں پروہا ہوا ہے۔







اِس یادگار میگا آزادی شو کے کامیاب انعقاد میں اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان اسلام آباد جناب عمران جاوید اور پروگرام منیجر طارق حسن شاہ کی زیرِ قیادت انتظامی و تخلیقی ٹیم اور عملے کی محنت خاص طور پر قابلِ ذکر رہی۔

معروف گلوکار اویس نیازی نے ملی نغموں سے سماں باندھا جبکہ دیگر فنکاروں اور موسیقاروں نے بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔ ریڈیو پاکستان کی خصوصی پیشکش "جشنِ پاکستان" کے عنوان سے تیار کردہ ملی نغمہ بھی پیش کیا گیا جسے ڈائریکٹر پروگرامز محترمہ مسرت شاہ رخ کی زیرِ نگرانی انچارج میوزک سیکشن ڈپٹی کنٹرولر بلال احمد رانا اور اُن کی ٹیم نے تیار کیا۔

تقریب کے دوران قائدِ اعظم محمد علی جناح کے تصورِ پاکستان، اُن کے فرمودہ اصولوں اتحاد، تنظیم اور یقینِ محکم کو بھی خصوصی طور پر یاد کیا گیا۔ مقررین نے بجا طور پر کہا کہ پاکستان مختلف زبانوں، ثقافتوں اور علاقائی روایات کا حسین امتزاج ہے مگر اِن تمام رنگوں کو ایک لڑی میں پرونے والی مشترکہ شناخت "پاکستانی" ہونے کی ہے۔

شام کے اختتام پر فضا میں یہی احساس محسوس ہوا کہ 14 اگست محض جشنِ آزادی کا دن نہیں بلکہ ایک تجدیدِ عہد کا موقع ہے۔ وہ عہد جس میں ماضی کی قربانیوں کا نذرانہ یاد رکھتے ہوئے حال کی ذمہ داریوں کو نبھانے اور مستقبل کے پاکستان کو مضبوط، سرسبز، خوش حال اور متحد بنانے کا عزم شامل ہے۔ مہدی حسن آڈیٹوریم ریڈیو پاکستان میں سجنے والی یہ شام اِسی روشن پیغام کے ساتھ مکمل ہوئی کہ پاکستان ہماری پہچان ہے، آزادی ہماری امانت ہے اور اِس امانت کی حفاظت ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔













بشکریہ پی بی سی اسلام آباد

یومِ فضائیہ شاہینوں کی لازوال داستان

پاک فضائیہ کے ہیرو ایم ایم عالم نے ایک منٹ میں دشمن کے 5 طیارے گرا کے عالمی ریکارڈ قائم کیا۔

تحریر: ممتاز عارف

ستمبر 1965ء کی "پاک بھارت جنگ" پاکستان کی تاریخ میں سنہرے باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ سترہ روزہ اِس جنگ میں 7 ستمبر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ 7 ستمبر۔۔۔ یعنی "یومِ فضائیہ"۔۔۔ پاکستان کی عسکری تاریخ کا ایک روشن اور ناقابلِ فراموش باب۔۔ ہر سال 7 ستمبر کو یہ دن اس عہد کی تجدید کے ساتھ منایا جاتا ہے کہ پاکستان ایئر فورس ہمیشہ مادرِ وطن کے دفاع کے لیے تیار ہے۔ اس کا ایک ثبوت پاک فضائیہ نے گزشتہ سال یعنی 2025ء میں "معرکۂ حق" کی صورت میں بھی دیا ہے۔ 7 ستمبر کا دن ہمیں ان بہادر شاہینوں کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے 1965ء کی جنگ میں اپنے ایمان، جرأت اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کی بدولت دنیا کو حیران کر دیا۔

پاک فضائیہ کا قیام 1947ء میں محض چند طیاروں اور محدود وسائل کے ساتھ ہوا۔۔۔ ابتدا مشکل تھی، لیکن یہ ادارہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا ہوا دنیا کی ایک منظم اور مضبوط فضائی قوت میں تبدیل ہو گیا۔ پاک فضائیہ نے ہمیشہ "ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ" کے نصب العین کو اپنی طاقت بنایا۔ محدود وسائل کے باوجود اِس نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت، جدید تربیت اور مضبوط حوصلے سے ہمیشہ یہ ثابت کیا کہ اصل طاقت ہتھیاروں میں نہیں بلکہ یقین اور ارادے میں ہے۔

ستمبر 1965ء میں جب دشمن ملک بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو اُس کا خیال تھا کہ وہ چند دنوں میں اس پاک سرزمین پر قبضہ کر لے گا لیکن پاکستانی شاہینوں نے اپنی بہادری اور بہترین جنگی حکمتِ عملی سے دشمن کے اس خواب کو چور کر دیا۔۔۔ لاہور، سرگودھا، سیالکوٹ اور دیگر جنگی محاذوں پر پاک فضائیہ کے شاہین صفت ہوابازوں نے دشمن کو پسپا کر کے دنیا کو یہ پیغام دیا کہ پاکستان ناقابلِ شکست ہے۔

7 ستمبر 1965ء کو اسکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم نے سرگودھا کی فضاؤں میں وہ کارنامہ انجام دیا جو دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف میں جھلملاتا رہے گا۔۔۔ اُنہوں نے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں دشمن یعنی بھارت کے پانچ لڑاکا طیارے مار گرائے اور سرگودھا کو بھارتی طیاروں کا قبرستان بنا دیا نیز اِس کے ساتھ ساتھ ایک ایسا عالمی ریکارڈ بھی قائم کر دیا جسے آج تک کوئی نہیں توڑ سکا۔ یہ کارنامہ صرف ایک فضائی لڑائی نہیں تھی بلکہ ایمان اور عزم کی جیت تھی۔ ایم ایم عالم نے دنیا کو بتایا کہ اصل طاقت ہتھیاروں میں نہیں، جذبے اور یقین میں ہے۔

یہ دن صرف ایم ایم عالم کی بہادری کی یاد نہیں دلاتا بلکہ اُن تمام شاہینوں کو سلام پیش کرنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے جنہوں نے اِس وطن کے لیے اپنی جانیں نچھاور کیں۔ سرفراز رفیقی شہید، یونس حسن شہید اور راشد منہاس شہید پاک فضائیہ کے وہ عظیم ہوا باز ہیں جنہوں نے اپنی جان قربان کر کے دشمن کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ تاریخ سرگودھا کے ایک عظیم سپوت اور ستمبر کی جنگ کے پاک فضائیہ کے ایک اور ہیرو جناب سیال چوہدری کے کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی جس نے دشمن کے دانت کھٹے کر دیئے۔ اِسی طرح کئی گمنام جوان، جنہوں نے سیالکوٹ اور سرگودھا ایئر بیس پر اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر وطنِ عزیز کے دفاع کو یقینی بنایا، یہ سب شیر جوان آج بھی ہماری قوم کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ ہر سال جب بھی یومِ فضائیہ منایا جاتا ہے تو 1965ء کی جنگ کے تمام ایمان افروز مناظر اور جذبوں کو گرما دینے والے واقعات خصوصاً سرگودھا کے شاہین صفت ہوابازوں کے کارنامے اور یہاں کے دلیر اور بہادر شہریوں کے جذبوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، بھارتی



جنگی طیارے چاہے دن کو حملہ آور ہوتے یا رات کو، پاک آرمی کی توپوں کا رخ تو خیر ان کی طرف ہوتا ہی تھا۔۔۔ ہمارے پاک فضائیہ کے شاہین اُن پر یوں جھپٹتے کہ سرگودھا کے شہریوں کا لہو گرما دیتے۔ یہاں کے شہری مکانوں کی چھتوں، گلی محلوں اور سڑکوں چوراہوں پر کھڑے ہو کر "پاکستان زندہ باد" اور "پاک فضائیہ زندہ باد" کے نعرے بھی لگاتے اور اِن فضائی جھڑپوں کا نظارہ بھی کرتے۔۔۔ یوں وہ فضائیہ کے شیر جوانوں کو خراجِ تحسین پیش کر کے اپنے محبت وطن ہونے کا ثبوت دیتے۔ میں نے 1965ء کی یہ جنگ اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے، اُس وقت وطن کے محافظوں اور شہریوں کے کیا جذبات تھے اُن کا بیان لفظوں میں نا ممکن ہے، بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ پوری قوم سیسہ پلائی دیوار کی طرح تھی اور وطن کے دفاع کے لئے کٹ مرنے کے لئے تیار تھی۔ سرگودھا ایئر بیس جسے اب مصحف آئر بیس کہا جاتا ہے دشمن کی آنکھ میں کھٹکتا تھا کیونکہ یہ ایئر بیس اُس وقت بھی پاکستان کا اہم ترین ایئر بیس تھا اور اب بھی ہے کیونکہ زیادہ تر اِسی آئر بیس سے ہمارے ہوا باز پروازیں بھرتے اور دشمن کے دفاعی ٹھکانوں کو تباہ و برباد کر دیتے۔ 1965 کی جنگ میں دشمن کی یہ بھرپور کوشش رہی کہ کسی طرح سرگودھا ایئر بیس کو تہس نہس کر دیا جائے لیکن دشمن کے طیارے جب بھی سرگودھا کی فضاؤں میں نمودار ہوئے تو ہمارے دلیر ہوابازوں نے انہیں ایسی مار ماری کہ سرگودھا کا نام سُن کر ہی دشمن کی ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔ 1965ء کی جنگ کے بعد کئی سال تک سرگودھا ایئر بیس پر جنگی طیاروں اور دیگر فضائی ساز و سامان کی نمائش ہوتی رہی جس میں شہری بھرپور جوش و جذبہ سے شرکت کرتے۔

یومِ فضائیہ صرف ایک دن نہیں بلکہ پوری قوم کے لیے فخر کا لمحہ ہے۔ یہ دن یاد دلاتا ہے کہ پاک فضائیہ اور عوام کا رشتہ محض محافظ اور محفوظ ہونے کا نہیں بلکہ اعتماد، محبت اور ایثار کا ہے۔ جب شاہین اپنے دشمن پر جھپٹ سٹتے ہیں تو پوری قوم کے دل اُن کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ یہ جذبہ ایک ایسا رشتہ ہے جو پاکستان کو مضبوط بناتا ہے۔

آج کا پاکستان بدلتے ہوئے عالمی تناظر میں بھی اپنی فضائی قوت پر فخر کرتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی، تربیت یافتہ جوان، اور نئے طیاروں کی بدولت پاکستان ایئر فورس ہر لمحہ تیار ہے۔ پاک فضائیہ نہ صرف سرحدوں کی محافظ ہے بلکہ قدرتی آفات میں عوام کی مدد، ریلیف آپریشنز اور قومی ترقی کے منصوبوں میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ پاک فضائیہ کا مقصد صرف جنگی مہارت نہیں بلکہ خدمتِ خلق بھی ہے۔

یومِ فضائیہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ایمان اور عزم کے سامنے کوئی بھی طاقت بڑی نہیں۔ یہ دن ہمیں اپنے ہیروز کو یاد کرنے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ اور "معرکۂ حق" سے لے کر آج تک پاکستان ایئر فورس کے شاہینوں نے ثابت کیا ہے کہ وطن کی حفاظت اُن کے ایمان کا حصہ ہے۔ یہ دن دراصل ایک نئے عزم اور تجدیدِ عہد کا دن ہے کہ پاکستان کے آسمان ہمیشہ آزاد اور محفوظ رہیں گے، اور شاہینوں کی پرواز ہمیشہ بلند رہے۔

بشکریہ پی بی سی سرگودھا

بارود: جو شیر شاہ سوری کی کامیابی اور موت دونوں کا سبب بنا

تحریر: سعید احمد شیخ

اُس کا اصل نام "فرید خان" تھا، اور وہ غور (افغانستان) کے ایک قبیلے "سور" کا ایک عام سا فرد تھا۔ فارسی لغات میں "سور" اُس خاکستری مائل گھوڑے، خچر یا گدھے کو کہا گیا ہے جس کی کاکل سے دم تک سیاہ دھاری کھنچی ہو۔ (بحوالہ: لغت نامہ دہخدا، ڈیجیٹل ایڈیشن)۔

قیاس یہ ہے کہ چونکہ اِس قبیلے کے پاس اِسی مخصوص رنگت کے گھوڑے یا خچر کثرت سے تھے، چنانچہ اِسی نسبت سے یہ قبیلہ "سور" اور اِس کے افراد "سوری" کہلائے جانے لگے۔ تاہم اِس توجیہہ کی کوئی صریح تاریخی شہادت دستیاب نہیں۔

فرید خان کو اپنی ذاتی جاگیر یا کاروبار نہ ہونے کے سبب اپنی عملی زندگی کا آغاز جونپور کے جمال خان کی ملازمت سے کرنا پڑا، جو ایک پرگنے کی نگرانی پر مشتمل تھی۔ اپنی اِس ملازمت سے بہتر نوکری کی تلاش میں وہ جونپور سے بہار آگیا اور وہاں حاکمِ بہار کی ملازمت اختیار کرلی۔

ایک روز دورانِ شکار ایک شیر اچانک حاکمِ بہار، سلطان محمد (اصل نام: بہاڑ خان) کے سامنے آگیا۔ فرید خان نے دِلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیام سے تلوار کھینچی اور شیر پر حملہ کرکے اُسے مار ڈالا۔ سلطان محمد اُس کی جرأت سے بے حد متاثر ہوا اور اُسے شیر خان کا خِطاب دے دیا۔ ساتھ ہی اپنے بیٹے جلال خان کی نیابت بھی اُس کے سپرد کردی، اور یوں وہ ترقی پاکر فرید خان سے شیر خان بن گیا۔ (بحوالہ: تاریخِ شیر شاہی، ص: 26)

1526ء میں جب مغل بادشاہ ظہیر الدِین محمد بابر ہندوستان میں وارِد ہوا تو یہ شیر خان حاکمِ بہار کی ملازمت سے بہتر وسیلہ روزگار کی تلاش میں اُس کے دربار میں بھی پہنچا۔ ایک دعوتِ بعام میں شاہی دسترخوان پر مچھلی پیش کی گئی تو دربار کی آداب سے ناواقفیت ہونے کے باعث اُس نے اپنے خنجر سے مچھلی کاٹنا شروع کردی۔ بابر نے یہ منظر دیکھا تو اپنے معتمدین سے اِس افغان کی غیر معمولی حرکت کا ذِکر کیا۔ شیر خان سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ اِتنا محتاط بھی تھا کہ بابر کی اپنے معتمدین کے ساتھ اِس مچھلی کھانے کے معاملے میں ہونے والی کانا پھوسی دیکھ کر اُسے اندیشہ ہوا کہ بابر اُس کے خِلاف کوئی تادیبی کارروائی کرنا چاہتا ہے؛ چنانچہ وہ خاموشی سے وہاں سے نکل آیا اور سسرام پہنچ کر سانس لیا۔

گو کہ شیر خان 21 اپریل 1526ء کو ظہیر الدِین محمد بابر اور سلطان اِبراہیم لودھی کے مابین ہونے والی جنگ میں عملی طور پر شریک نہیں تھا، تاہم اِس جنگ نے اُس کی شخصیت پر کئی گہرے اثرات مرتب کیے۔ اول: اُس نے بابر کی کامیابی اور اِبراہیم لودھی کی ناکامی کی وجوہات کا عسکری امور کے کسی شائق طالبِ علم کی مانند نہایت عمیق مطالعہ کیا اور اِس کے نتائج کو اپنی باقی ماندہ زِندگی کے لیے مشعلِ راہ بنالیا۔ دوم: خود ایک افغان ہونے کی حیثیت سے اُس نے اپنے ایک افغان بھائی (اِبراہیم لودھی) کی شکست کو اپنے دِل پر لیا۔ سوم: اُس نے اپنے تئیں مغلوں کو غاصِب سمجھ کر اُنہیں ہندوستان سے باہر نِکال دینے کا عزمِ مصمم کرلیا۔ (بحوالہ: تاریخِ شیر شاہی، ص:)

شیر خان نے بابر اور اِبراہیم لودھی کے مابین ہونے والی جنگ پانی پت سے جو بنیادی نکتہ سیکھا، وہ بارود کے بہترین اور بروقت اِستعمال سے متعلق تھا۔

شیر خان کی رائے یہ تھی کہ بابر نے بارود سے چلنے والی عثمانی طرز کی توپوں اور فتیلہ دار بندوقوں کے زور پر سلطان اِبراہیم لودھی کی رِوایتی جنگی حکمتِ عملی کو ناکام بنا کر اُسے شکست سے دوچار کیا تھا۔ مثال کے طور پر لودھی سپاہ کا ایک بڑا مؤثر عنصر اُس کے جنگی ہاتھی تھے، لیکن جب اِن ہاتھیوں نے مغل توپوں سے داغے گئے گولوں کے دھماکے پہلی مرتبہ سنے تو وہ خوف زدہ ہو کر اپنی ہی صفوں میں گھس گئے اور اپنے ہی لشکر کو روندنے لگے۔



چنانچہ اِبراہیم لودھی کی شکست کے جملہ اسباب کو پیشِ نظر رکھ شیر خان کو یقین ہو گیا کہ اب ہِندوستان میں آئندہ کسی بھی جنگ کو جیتنے کے لیے صرف ہاتھی، تلوار اور نیزہ کافی نہیں ہوں گے؛ اب بارود اور توپ خانے کا کردار ہی فیصلہ کُن ہوگا۔

شیر خان سمجھتا تھا کہ اگر اِبراہیم لودھی کے پاس (بابر کی طرح کا) بارود ہوتا تو پانی پت کا میدان کبھی بابر کے ہاتھ نہ لگتا۔ چنانچہ اُس نے اپنی توسیع پسند طبیعت کو پہلے اِبراہیم لودھی کی غلطیوں سے سبق یافتہ افغان کے سانچے میں ڈھالا اور پھر مغلوں کو ہندوستان سے چلتا کرنے کے اپنے منصوبے کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔

1530ء میں شیر خان کے گھڑ سواروں کی تعداد چھ ہزار تھی جسے اُس نے 1537ء میں بڑھا کر ستر ہزار تک پہنچایا۔ تاہم اُس کی اصل توجہ، بارود کے وافر ذخیرے اور اِس کے درست اِستعمال پر ہی مرکوز رہی۔

اگر بنگاہِ حقیقت دیکھا جائے تو یہ بارود ہی تھا جس کو اپنی اصل عسکری طاقت بناتے ہوئے شیر خان نے پہلے بِہار اور پھر بنگال، قنوج اور آگرہ کو زیر نگیں کیا اور پھر آخر میں 1540ء میں دِہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب وہ شیر خان نہیں، شیر شاہ تھا؛ خاندانِ سوریہ کا پہلا بادشاہِ ہند، جس نے بابر کے بیٹے نصیر الدِین ہمایوں سے بزورِ شمشیر اِقتدار چھینا تھا۔

فرید خان کا شیر شاہ کے طور پر 17 مئی 1540ء کو ہندوستان کی زِمامِ اِقتدار سنبھالنا تاریخِ ہند کا ایک اہم واقعہ شمار کیا جاتا ہے، جس نے بڑی حد تک یہاں کے اِنتظامی، عسکری، مالیاتی اور مواصلاتی نِظام کے خدوخال کو بدلا۔ تاہم فرید خان کو قدرت سے یہ شِکوہ رہا کہ وہ اُس پر تب مہربان ہوئی جب وہ بڑھاپے میں قدم رکھ چکا تھا۔ اپنی شاہی کے اِبتدائی دِنوں میں ایک دفعہ آئینے میں اپنے سفید بال دیکھ کر بے اِختیار بولا: افسوس! تخت مجھے اُس وقت ملا، جب میری عمر کا سورج غروب ہونے کو ہے۔

(بحوالہ: کیمبرج ہسٹری آف اِنڈیا، ص: 437)

اگر شیر شاہ سوری کی عسکری کامیابیوں کا جائزہ لیا جائے تو وہ گھڑ سوار دستوں کو مضبوط کرنے اور نقد تنخواہوں کا نِظام مستحکم کرنے کے کہیں بڑھ کر بندوقچیوں کے مستقل دستے تیار کرنے، بارود کے گولے اور بارود کی مدد سے لوہے، سیسے اور دِیگر دھاتوں کی گولے پھینکنے والی ہلکی اور بھاری توپیں بنوانے اور بارود کے بنیادی عناصِرِ ترکیبی (شورے اور گندھک) کی ترسیلی کڑی کے بِلا تعطل ہونے کے مرہونِ منت نظر آتی ہیں۔

اِسی لیے کچھ مؤرخین کی رائے یہ ہے کہ شیر شاہ نے حقیقی معانی میں بارود اور اُس سے جڑی جنگی مشینری کی طاقت کی بنیاد پر سوری سلطنت یا سوری بادشاہت کی بنیاد رکھی تھی۔

شیر شاہ کے زمانے میں بارود تین بنیادی اجزاء (شورہ، گندھک اور لکڑی کے کوئلے) سے تیار ہوتا تھا۔ اِن میں سب سے اہم جز شورہ (Saltpetre) تھا، اور اِتفاق سے بِہار، جہاں سے شیر شاہ نے اپنی سیاسی زِندگی کا آغاز کیا، پورے برِصغیر میں شورے کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اِس طرح اُسے بارود کے بنیادی خام مال تک براہِ راست رسائی حاصل تھی۔ کوئلہ بھی مقامی طور پر عام دستیاب تھا۔ گندھک کے تاجروں کو کیونکہ شیر شاہ کی افسر شاہی کے متعلقہ دفاتر سے اُن کے مال کی نقد ادائیگی ہو جاتی تھی، اِس لیے یہ جِنس بھی بارود کی تیاری کے لیے ہمہ وقت وافر مقدار میں موجود رہتی تھی۔

بارود کی وافر دستیابی کے باعث شیر شاہ نے ہِندوستان میں فنِ توپ سازی کو باقاعدہ طور پر منظم کیا۔ "ضربِ زن" کہلانے والی ہلکی اور متحرک توپوں میں نِسبتاً کم تانبا اِستعمال ہوتا تھا اور اُن کی نال باریک رکھی جاتی تھی تاکہ یہ کم بارود سے چھوٹے دھاتی گولے داغ سکیں۔ دو یا تین توپچی اُنہیں فصیلوں پر آسانی سے نصب کرکے چلا سکتے تھے۔ اِس کے ساتھ محاصروں کے لیے بھاری توپیں بھی تیار کی گئیں۔

شیر شاہ کی متعارف کردہ ہلکی اور کم خرچ توپوں کا یہ تصور اِتنا مؤثر ثابت ہوا کہ اکبر کے عہد میں بھی اِسی نوع کی متحرک توپیں مقبول رہیں۔

شیر شاہ کے توپ خانے کی ترقی کا ایک اہم ثبوت آج بھی محفوظ توپوں اور اُن پر کندہ فارسی کتبوں کی صورت میں موجود ہے۔ اندور، ڈھوبیلا، وریندر ریسرچ میوزیم راجشاہی اور بنگلہ دیش کے قومی عجائب گھر میں شیر شاہی توپوں کے متعدد نمونے محفوظ ہیں۔ بنگال سے ملنے والی بعض توپوں پر 948ھ تا 949ھ (1541ء تا 1543ء) کے سنین درج ہیں۔ اُن کے کتبوں میں توپ ساز کا نام سید احمد رومی اور ایک نمونے پر اُن کی تیاری کا حکم دینے والے افسر کا نام خواجہ بِشارت سلطانی درج ہے۔

مذکور بالا توپوں میں سے بعض کے دہانے شیر کے کھلے ہوئے منہ کی مانند ڈھالے گئے تھے، جو اُس دور کی دھات کاری اور توپ سازی کے اعلیٰ معیار کی نِشان دِہی کرتے ہیں۔ جدید محققین سید احمد رومی کو عثمانی رِوایت سے وابستہ توپ ساز قرار دیتے ہیں؛ چنانچہ اُس کے نام کے ساتھ رومی کی نِسبت محض جغرافیائی لقب نہیں بلکہ عثمانی توپ سازی سے اُس کے فنی تعلق کی بھی علامت معلوم ہوتی ہے۔

توپوں کے علاوہ بارود سے چلنے والی فتیلہ دار بندوقیں، جنہیں برِصغیر میں توڑے دار بندوقیں بھی کہا جاتا تھا، شیر شاہ کی جنگی مشینری کا ایک اہم حصہ بنیں۔ اُس نے بندوقچیوں کے باقاعدہ دستے قائم کیے اور اُنہیں اہم قلعوں اور فوجی مراکز میں مستقل طور پر تعینات کیا۔ ہمعصر تاریخی ماخذات سے اخذ کردہ جدید تخمینے کے مطابق شیر شاہ کے زیرِ خِدمت بندوقچیوں کی مجموعی تعداد پچیس سے ستائیس ہزار کے درمیان تھی، تاہم یہ سب اُس کی مرکزی سپاہ میں یکجا نہیں تھے بلکہ سلطنت کے مختلف قلعوں اور چھاؤنیوں میں تقسیم تھے۔

شیر شاہ نے اپنی متعدد میدانی لڑائیوں میں فتیلہ دار بندوقوں اور ہلکی توپوں سے کام لیا، جبکہ مضبوط قِلعوں کی تسخیر کے لیے وہ بھاری تانبے کی توپوں اور بارود سے بھرے آتشیں گولوں کا بھی اِستعمال کرتا رہا۔ دوسرے لفظوں میں، اُس نے بارود کو ایک منظم رِیاستی اور عسکری قوت میں تبدیل کیا۔

رائے سین کے قِلعے کا محاصرہ جب طول پکڑنے لگا تو شیر شاہ نے حکم دیا کہ لشکر کے بازاروں، سپاہیوں کے ڈیروں اور کھانے پینے کے برتنوں میں موجود تمام تانبا جمع کرلیا جائے اور اِس سے بھاری توپیں ڈھالی جائیں۔ حکم کی تعمیل میں دستیاب تانبا جمع کیا گیا اور موقع ہی پر توپیں تیار کی گئیں۔ جب یہ توپیں تیار ہو گئیں تو شیر شاہ نے حکم دیا کہ قِلعے کی فصیل کو چاروں طرف سے ایک ہی وقت میں گولہ باری کا نِشانہ بنایا جائے۔ تاریخِ شیر شاہی کے مطابق، شدید گولہ باری سے قِلعے کی دِیواروں میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے، جس سے پورن مل خوف زدہ ہوا اور بالآخر قِلعہ شیر شاہ کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

اِس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ کی فوج محاصرے کے دوران مقامی طور پر دستیاب دھات جمع کر کے موقع ہی پر بھاری توپیں تیار کرنے اور اُنہیں فوری طور پر قِلعہ شِکنی کے لیے اِستعمال کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ (بحوالہ: تاریخِ شیر شاہی، ص: 212)

رائے سین کی فتح کے بعد شیر شاہ نے اپنی فوجی توجہ کالنجر کے مضبوط قِلعے کی طرف مبذول کی۔ تاہم بدقسمتی سے یہ اُس کی آخری فوجی مہم ثابت ہوئی۔ کالنجر کے محاصرے میں بھی بندوقوں اور بارود سے بھرے آتشیں گولوں کا اِستعمال کیا گیا۔ شیر شاہ نے قِلعے کی فصیلوں پر یہ گولے پھینکنے کا حکم دیا تاکہ اندر آگ لگائی جاسکے اور مدافعین کی مزاحمت توڑی جاسکے۔

محاصرے کے دوران بارود سے بھرا ایک آتشیں گولا قِلعے کی فصیل سے ٹکرایا اور پلٹ کر اُس مقام پر آگرا جہاں ایسے گولوں اور بارود کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اُس کے گرتے ہی ذخیرے نے آگ پکڑلی اور یکے بعد دِیگرے زبردست دھماکے ہونے لگے۔ شیر شاہ بھی اِن دھماکوں کی زد میں آکر بری طرح جھلس گیا۔

شدید زخمی ہونے کے باوجود شیر شاہ نے حملہ روکنے کے بجائے اپنے امراء کو حکم دیا کہ میرے زِندہ رہتے ہوئے قِلعہ فتح کرو۔ اُس کے حکم پر افغان سپاہ ہر طرف سے قِلعے پر ٹوٹ پڑی اور دوپہر تک کالنجر فتح کرلیا گیا۔

فتح کی خبر سُن کر شیر شاہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، لیکن بارود سے لگنے والے زخم جان لیوا ثابت ہوئے اور 22 مئی 1545ء کی نصف شب کے بعد اُس کا اِنتقال ہو گیا۔

یوں تاریخ نے ایک عجیب منظر دیکھا کہ شیر شاہ سوری نے جس بارود کو اپنی سلطنت کے حصول اور پھر اِس کے اِستحکام کے لیے اِستعمال کیا، وہی بارود اُس کی زِندگی کے خاتمے کی سبیل بنا۔

تلوار نے فرید خان کو شیر خان بنایا اور بارود نے شیر خان کو شیر شاہ بنایا، مگر امرِ الٰہی، جو نہیں ٹل سکتا، کہ یہی بارود بالآخر شیر شاہ کی موت کا سبب بنا۔

دنیا ہے کتاب اندر: معاشرتی ترقی میں کُتب خانوں کا کلیدی کردار

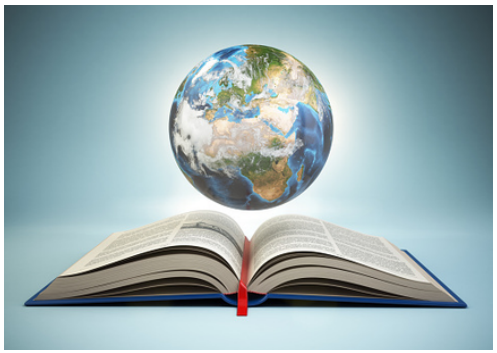
تحریر: شیخ محمد ارشد ڈائریکٹر جنرل، محکمہ کُتب خانہ جات، اسلام آباد

علم و آگہی انسانی تہذیب کی وہ بنیاد ہے جس پر اجتماعی شعور، فکری بالیدگی اور تمدن کی مضبوط عمارت استوار ہوتی ہے۔ تاریخ کا عمیق مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ وہی معاشرے ترقی، استحکام اور بقاء کی معراج تک پہنچے جنہوں نے علم کے تحفظ، ترسیل اور فکری تحقیق کو اپنی اجتماعی ترجیحات میں سر فہرست رکھا۔ اِس طویل فکری و ارتقائی سفر میں کُتب خانوں نے ہمیشہ ایک خاموش مگر نہایت انقلابی محرک کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ لائبریری محض کاغذ، سیاہی اور جلدوں کے ایک بے جان ذخیرے کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ در حقیقت قوموں کی اجتماعی یادداشت، انسانی تجربات کے نچوڑ اور ایک روشن و خوشحال مستقبل کا سنگم ہے۔

کُتب خانوں کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا خود انسانی شعور کا ارتقائی سفر۔ قدیم بابل و نینوا کی مٹی کی تختیوں سے لے کر اسکندریہ کی عظیم الشان لائبریری تک، کُتب خانے ہمیشہ فکری تسلسل کے محافظ رہے ہیں۔ عباسی عہد میں قائم ہونے والا بغداد کا بیت الحکمت اِس حقیقت کی روشن ترین تاریخی مثال ہے، جہاں دنیا بھر کے فلسفیانہ، سائنسی، فلکیاتی اور طبّی علوم کو ترجمے اور تحقیق کے ذریعے یکجا کیا گیا۔ اِس علمی مرکز نے نہ صرف اسلامی دنیا میں علمی نشاۃ الثانیہ کو جنم دیا بلکہ بعد ازاں یورپی نشاۃ الثانیہ کی بھی ٹھوس فکری بنیاد رکھی۔ اسی طرح قرطبہ اور قاہرہ کے کُتب خانوں نے قرونِ وسطیٰ کے تاریک دور میں علم کی وہ شمعیں روشن کیں جن سے پوری دنیا منور ہوئی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جب یورپ اور امریکہ میں عوامی کُتب خانوں کی باقاعدہ تحریک نے جنم لیا، تو علم چند امرا اور مراعات یافتہ طبقوں کے محلات سے نکل کر عام محنت کش انسان کی دسترس میں آگیا، جس نے مجموعی انسانی معاشرت کو ایک نئی جمہوری اور مساوی سمت عطا کی۔

رومن مفکر اور شہرہ آفاق خطیب مارکس ٹولیس سسرو نے کُتب خانوں کی بنیادی اہمیت کو اپنے خوبصورت قول میں واضح کیا تھا کہ اگر کسی انسان کے پاس ایک باغ اور ایک لائبریری موجود ہے، تو سمجھ لیجیے کہ اُس کے پاس ایک مکمل اور باوقار زندگی گزارنے کے لیے تمام تر ضروریات فراہم ہیں۔ معاشرتی ترقی محض صنعتی پھیلاؤ یا مادی و معاشی خوشحالی کا نام نہیں ہے، بلکہ حقیقی معاشرتی پیش رفت کا گہرا تعلق سماجی عدل، تعلیمی بیداری، اخلاقی ہم آہنگی اور شہریوں کے فکری معیار سے جڑا ہوتا ہے۔ کُتب خانے معاشرے کے ہر فرد کو بلا تفریق رنگ، نسل، مذہب، زبان، جنس اور معاشی حیثیت مطالعے اور ذاتی نشوونما کے یکساں مواقع فراہم کر کے طبقاتی خلیج کو ختم کرتے ہیں۔ یہ ادارے ایک ایسے غیر جانبدار اور پُرامن پلیٹ فارم کا کردار ادا کرتے ہیں جہاں ایک عام مزدور کا بچہ اور ایک صاحبِ ثروت شخص ایک ہی میز پر بیٹھ کر علم کی روشنی سے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ یہ مساوات معاشرتی یکجہتی کو مضبوط بناتی ہے، معاشی پسماندگی کی فکری روک تھام کرتی ہے اور محروم طبقات کو خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھنے کے مساوی مواقع فراہم کرتی ہے۔

کُتب بین معاشرہ سطحی سوچ، انتہا پسندی اور بے بنیاد افواہوں سے محفوظ رہتا ہے، کیونکہ کُتب خانوں کے اندر پروان چڑھنے والا فکری ماحول انسان میں تنقیدی شعور، غیر جانبدارانہ تجزیہ اور باہمی مکالمے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ جب کسی قوم کے افراد میں دلائل اور حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کی عادت راسخ ہو جاتی ہے، تو وہاں عدم برداشت اور تعصب کی جگہ فکری رواداری اور باہمی احترام کا کلچر فروغ پاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے یعنی یونیسکو کے عوامی لائبریری منشور میں اِس بات کی باضابطہ توثیق کی گئی ہے کہ عوامی کُتب خانہ باخبر اور باشعور شہریوں کی تشکیل کے ذریعے جمہوریت کی بقاء، سماجی استحکام اور فکری آزادی کا بنیادی ضامن ہے۔



مشہور امریکی ماہرِ فلکیات اور مصنف کارل ساگن نے اپنی شاہکار کتاب "کوسموس" میں لائبریری کی مجازاتی حیثیت بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ لائبریری انسان کو زمان و مکان کی قید سے آزاد کرتی ہے اور یہ اِس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ انسان جادو کر سکتا ہے، کیونکہ اِس کے ذریعے ہزاروں سال پہلے اِس دنیا سے رخصت ہو جانے والا مفکر براہِ راست ہمارے ذہن اور دل سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اِسی طرح ارجنٹائن کے عالمی شہرت یافتہ ادیب خورخے لوئس بورخیس نے کُتب خانوں کی روحانی و فکری وسعت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ اُنہوں نے ہمیشہ جنت کا تصور ایک لائبریری کی مانند کیا ہے۔ برطانوی مصنف نیل گیمن کا یہ قول بھی کُتب خانوں کی آزادی فکر کے حوالے سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کہ کُتب خانے فکری آزادی، معلومات تک مساوی رسائی، تعلیم، تفریح، محفوظ مقامات کی فراہمی اور معاشی مواقع کی تخلیق کے حقیقی ضامن ہیں۔

اکیسویں صدی میں جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی، مصنوعی ذہانت اور ڈیجیٹل انقلاب کے غلبے نے کُتب خانوں کے روایتی ڈھانچے اور تنظیمی ذمہ داریوں کو یکسر بدل کر ایک نیا تنوع بخشا ہے۔ آج کا جدید کُتب خانہ صرف چھپی ہوئی کتابوں کے مطالعے کا مسکن نہیں رہا، بلکہ یہ ایک کثیر المقاصد ڈیجیٹل نالج ہب میں تبدیل ہو چکا ہے جہاں ای بُکس، بین الاقوامی ریسرچ جرائد اور آن لائن گلوبل ڈیٹا بیسز تک فوری رسائی میسر ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ ادارے متحرک کمیونٹی سینٹرز کا روپ دھار چکے ہیں جہاں علمی نشستیں، سیمینارز، بین المذاہب مباحثے اور نوجوانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے معلوماتی ورکشاپس منعقد کی جاتی ہیں۔ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ کے اِس تیز رفتار دور میں جہاں غلط معلومات، جعلی خبروں اور فکری انتشار کا ایک سیلاب اُمڈ آیا ہے، کُتب خانے آج بھی مستند، تصدیق شدہ اور تحقیق پر مبنی معلومات کا سب سے معتبر اور محفوظ قلعہ ہیں۔

کسی بھی قوم کی پائیدار ترقی، خوشحالی اور سماجی ہم آہنگی کا دارومدار اُس کے تعلیمی اور تحقیقی رویوں پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے معاشرے کو جمود، جہالت اور پسماندگی کی دلدل سے نکال کر ترقی، جدت اور شعور کی شاہراہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں قومی، علاقائی، شہری اور تعلیمی سطح پر کُتب خانوں کے نظام کو جدید خطوط پر استوار کرنا ہوگا۔ ڈیجیٹل وسائل کی فراہمی یقینی بنانا ہوگی اور نئی نسل میں کتاب دوستی کے جذبے کو از سرِ نو زندہ کرنا ہوگا۔ انسان اور کتاب کا رشتہ جتنا گہرا اور مضبوط ہوگا، ہمارا معاشرہ فکری، اخلاقی، سماجی اور تمدنی اعتبار سے اتنا ہی باوقار اور تابناک ہوگا۔

خوشگوار ستمبر اور موسمیاتی تبدیلی

تحریر: خوش بخت شیریں

ستمبر آتے ہی فضا میں ایک ایسا خوبصورت احساس پھیلنا شروع ہو جاتا ہے کہ مانو آسمان نے اپنا سینہ کھول دیا ہو اور آسمانی احساسات زمین کے مکین ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب نہ تو جولائی جیسی جلانے والی گرمی ہوتی ہے اور نہ ہی دسمبر جیسی کڑکڑاتی سردی۔ برسات کے بادل آہستہ آہستہ اپنے مقامِ اصل کی طرف رختِ سفر باندھ رہے ہوتے ہیں اور درختوں کے پتے ہلکی سی سرگوشی کر کے خزاں کے آنے کا پتہ دینے لگتے ہیں۔ ہوا کے مزاج میں ایسی ہلکی سی نرمی آجاتی ہے کہ دلوں کے خرابے روشن ہو جائیں۔ صبح کے اوقات میں فضا میں ایسی خوشگواری محسوس ہوتی ہے کہ جیسے شروع جوانی میں زندگی ہر ہر لمحہ نئی کروٹیں لے رہی ہو۔ اِسی طرح شام ڈھلتے ہی موسم میں ایسی ہلکی سی ٹھنڈک گھلنے لگتی ہے جو انسان کو بے اختیار کھلی فضا میں کچھ دیر بیٹھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرت گرمی کی طویل شدت کے بعد ہمیں سکون کا ایک مختصر سا وقفہ دے رہی ہو۔ ہمارے اپنے شہر میرپور، یعنی آزاد جموں کشمیر کے دل میرپور میں ستمبر کی بات ہی کچھ اور ہے۔ گرمیوں کے طویل اور تپتے دنوں کے بعد، جب صبح و شام کی ہوا میں ہلکی سی ٹھنڈک گھلتی ہے تو دل کو ایک عجیب سا اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ عام طور پر ستمبر میں یہاں دن کا درجہ حرارت بتیس ڈگری اور رات کا تقریباً بائیس ڈگری سینٹی گریڈ کے آس پاس رہتا ہے۔ دن کے اوقات میں گرمی اب بھی اپنا احساس دلاتی ہے، لیکن صبح اور شام کے وقت موسم نسبتاً خوشگوار ہو جاتا ہے۔ دریائے جہلم کا بہاؤ، منگلا جھیل کا نیلگوں پانی، اِرد گرد کی پہاڑیاں اور اُن پر پھیلی ہریالی اِس موسم میں دل کو بہت بھاتی ہے۔ اگر آپ کسی شام منگلا جھیل کے کنارے کھڑے ہو کر ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھیں اور ہلکی ہوا کے جھونکوں کو محسوس کریں تو شاید آپ کو اندازہ ہو کہ ستمبر کو تبدیلی کا موسم کیوں کہا جاتا ہے۔

یہ وہی موسم ہے جس میں برسات کی نمی ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی ہوتی، لیکن خزاں کی آمد کے آثار بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ درختوں کے پتے اپنا سبز رنگ بدلنے لگتے ہیں اور زمین پر گرے ہوئے چند زرد پتے ہمیں خاموشی سے بتاتے ہیں کہ موسم ایک اور مرحلے میں داخل ہونے والا ہے۔ پرندوں کی آوازیں، صبح کی روشنی، شام کی نرم دھوپ اور بدلتی ہوئی ہوا مل کر میرپور کے منظر کو ایک خاص حُسن عطا کرتے ہیں۔ ایسے میں انسان کا دل چاہتا ہے کہ کچھ دیر اپنے روزمرہ کے مسائل سے دُور ہو کر صرف قدرت کو دیکھے اور اِس کے حُسن کو محسوس کرے۔

لیکن ستمبر کی یہ خوبصورتی ہمیں ایک اہم سوال کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ کیا ہمارے موسم واقعی پہلے جیسے ہیں۔؟ کیا اب بھی موسم کی شدت اتنی ہی کم ہے جتنی کبھی ہوا کرتی تھی۔ جب ہم اپنے بزرگوں سے سنتے ہیں کہ پہلے موسم کتنے باقاعدہ ہوا کرتے تھے، گرمی، برسات، خزاں اور سردی سب اپنے وقت پر آتے تھے، تو دل سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آج ایسا کیوں نہیں رہا؟ ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ اُنہیں معلوم ہوتا تھا کہ کس وقت بارشیں ہوں گی، کب سردی شروع ہو گی اور کب گرمی اپنے عروج پر پہنچے گی۔ آج صورتِ حال کچھ مختلف دکھائی دیتی ہے۔ موسموں کا مزاج بدل رہا ہے اور بعض اوقات موسم کی شدت اور بے ترتیبی حیران بھی کرتی ہے اور پریشان بھی۔ کبھی گرمی اتنی لمبی ہو جاتی ہے کہ جینا محال محسوس ہونے لگتا ہے، کبھی بارش کا طویل انتظار رہتا ہے اور پھر اچانک اتنی شدید بارش ہو جاتی ہے کہ شہری علاقوں میں سیلاب جیسا سماں بن جاتا ہے۔ کہیں خشک سالی کا خطرہ پیدا ہوتا ہے تو کہیں معمول سے زیادہ بارشیں فصلوں، گھروں اور سڑکوں کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہیں۔ کبھی سردی دیر سے آتی ہے اور کبھی موسم اچانک اپنا مزاج بدل لیتا ہے۔ یہ سب کچھ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہماری زمین کے موسمی نظام میں آخر کیا تبدیلیاں آ رہی ہیں۔



یہاں climate change، یعنی موسمیاتی تبدیلی، کا ذکر ناگزیر ہو جاتا ہے۔ موسمیاتی تبدیلی محض ایک سائنسی اصطلاح نہیں بلکہ ہماری روزمرہ زندگی سے جڑا ہوا مسئلہ ہے۔ زمین کے اوسط درجۂ حرارت میں اضافہ، موسموں کے patterns میں تبدیلی، شدید گرمی کی لہریں، غیر معمولی بارشیں، خشک سالی اور پانی کے وسائل پر بڑھتا ہوا دباؤ اِس مسئلے کی مختلف شکلیں ہیں۔

یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہر شدید بارش یا ہر گرم دن کو climate change کا نتیجہ قرار دینا درست نہیں، کیونکہ موسم میں قدرتی اتار چڑھاؤ ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ لیکن عالمی درجۂ حرارت میں مسلسل اضافہ ہمارے موسمی نظام کو ضرور متاثر کر رہا ہے اور extreme weather کے خطرات کو بڑھا سکتا ہے۔ ہمارے ملک کے موسمیاتی اعداد و شمار بھی اِس جانب توجہ دلاتے ہیں کہ درجۂ حرارت میں اضافہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے۔ جب صرف دن ہی نہیں بلکہ راتیں بھی معمول سے زیادہ گرم ہونے لگیں تو ہمیں اِس کے اثرات کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے۔ سوچیے، جب رات کا درجۂ حرارت بھی زیادہ رہے گا تو انسانوں، جانوروں اور پودوں کو آرام اور بحالی کا وہ موقع کیسے ملے گا جو اُنہیں پہلے ملتا تھا؟ رات کی ٹھنڈک صرف انسان کے سکون کے لیے ضروری نہیں، بلکہ قدرتی نظام کے لیے بھی اہم ہے۔ میرپور، بھمبر اور کوٹلی جیسے نسبتاً گرم علاقوں میں بڑھتی ہوئی گرمی کے اثرات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ گرمی کا مطلب صرف پسینہ اور بے آرامی نہیں۔ اِس کا مطلب زیادہ بجلی کا استعمال، ایئر کنڈیشنر اور پنکھوں کی بڑھتی ہوئی ضرورت، پانی کی زیادہ طلب اور اُن لوگوں کے لیے اضافی مشکلات ہے جو کھلے آسمان تلے کام کرتے ہیں۔ ہمارے کسان، مزدور، تعمیراتی کارکن، ٹریفک پولیس اور دیگر outdoor workers گرمی کی شدت کو براہِ راست برداشت کرتے ہیں۔ اگر گرمی کا دورانیہ بڑھتا ہے تو اُن کی صحت اور کام کرنے کی صلاحیت دونوں متاثر ہو سکتی ہیں۔

موسمیاتی تبدیلی کا ایک اہم تعلق پانی سے بھی ہے۔ میرپور کی شناخت ہمارا منگلا ڈیم اور منگلا جھیل ہے۔ پانی ہمارے لیے صرف ایک قدرتی وسیلہ نہیں بلکہ ہماری زندگی، زراعت، خوراک اور معیشت کی بنیاد ہے۔ اگر بے وقت بارشوں کا تسلسل یونہی تبدیل ہوتا رہا تو پانی کی دستیابی بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ کبھی کم وقت میں بہت زیادہ بارش ہو جاتی ہے اور کبھی بارش کا طویل وقفہ خشک سالی کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ دونوں صورتیں اپنے اندر مشکلات رکھتی ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ بہت زیادہ پانی بھی ہمیشہ فائدہ مند نہیں ہوتا۔ اگر بارش کم وقت میں انتہائی زیادہ ہو تو پانی زمین میں جذب ہونے کے بجائے تیزی سے بہہ سکتا ہے، جس سے سیلاب، زمین کے کٹاؤ اور شہری drainage کے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔

دوسری طرف اگر طویل عرصے تک بارش نہ ہو تو زیرِ زمین پانی، فصلیں، باغات اور گھریلو ضروریات سب متاثر ہو سکتے ہیں۔ اِسی لیے پانی کا تحفظ آج کے دور میں صرف ایک اچھی عادت نہیں بلکہ ہماری ضرورت بن چکا ہے۔ ہم اکثر خزاں کو دیکھ کر شاعری کرنے لگتے ہیں۔ زرد پتوں کو دیکھ کر اُداس ہو جاتے ہیں، ٹھنڈی ہوا کو محسوس کر کے پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں اور بدلتے موسم میں زندگی کے مختلف رنگ تلاش کرتے ہیں۔ لیکن ذرا گہرائی میں سوچیں تو خزاں ہمیں ایک بہت خوبصورت سبق بھی دیتی ہے۔ درخت اپنے پرانے پتے چھوڑتا ہے تو نئی بہار کے لیے راستہ بناتا ہے۔ خزاں ہمیں بتاتی ہے کہ تبدیلی فطرت کا لازمی حصہ ہے۔ کچھ چیزیں ختم ہوتی ہیں تاکہ نئی چیزوں کے لیے جگہ پیدا ہو سکے۔ مگر آج جو ماحولیاتی تبدیلی ہم دیکھ رہے ہیں، اِس میں ایک بڑا کردار انسانی سرگرمیوں کا بھی ہے۔ صنعت، توانائی کے بے دریغ استعمال، جنگلات کی کٹائی، گاڑیوں سے اخراج، غیر ضروری consumption اور قدرتی وسائل کے غیر ذمہ دارانہ استعمال نے ماحول پر دباؤ بڑھایا ہے۔

مسئلہ یہ نہیں کہ انسان ترقی کیوں کر رہا ہے؛ مسئلہ یہ ہے کہ ترقی کا راستہ ایسا ہونا چاہیے جو قدرتی وسائل کو مکمل طور پر ختم نہ کر دے۔ ہمیں development بھی چاہیے اور sustainability بھی۔ اِس لیے اَب صرف یہ کہہ کر چُپ نہیں بیٹھ جانا کہ واہ، کیا خوبصورت موسم ہے۔ ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ اِس حُسن کو ہم آنے والی نسلوں کے لیے کیسے محفوظ کریں۔ کیا ہمارے بچے بھی ستمبر کی ایسی ہی ٹھنڈی شامیں محسوس کر سکیں گے؟ کیا وہ منگلا جھیل کے کنارے اِسی طرح ہریالی دیکھ سکیں گے؟ کیا ہمارے درخت، پرندے، پانی اور کھیت اِسی طرح موجود رہیں گے؟

اِن سوالات کا جواب آج کے ہمارے فیصلوں میں چھپا ہوا ہے۔ درخت اِس سلسلے میں ہمارے سب سے اہم ساتھی ہیں۔ درخت صرف زمین کی سجاوٹ نہیں ہیں بلکہ یہ ہمارے قدرتی نظام کا بنیادی حصہ ہیں۔ وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتے ہیں، آکسیجن فراہم کرتے ہیں، سایہ دیتے ہیں، مٹی کے کٹاؤ کو کم کرتے ہیں اور بے شمار پرندوں اور جانوروں کو پناہ دیتے ہیں۔ شہری علاقوں میں درخت گرمی کی شدت کو کم کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ میر پور جیسے نسبتاً گرم علاقے میں گھروں کے آس پاس، سڑکوں کے کنارے، اسکولوں، کالجوں، سرکاری اداروں اور خالی جگہوں پر شجرکاری بے حد ضروری ہے۔ لیکن یاد رکھیے، صرف پودا لگانا کافی نہیں۔ پودا لگانا ایک خوبصورت آغاز ہے، مگر اِس پودے کو پانی دینا، اِس کی حفاظت کرنا اور اسے بڑا ہونے تک سنبھالنا اصل ذمہ داری ہے۔ اگر ہم ہر سال صرف چند پودے لگائیں اور اُن کی حفاظت بھی کریں تو چند سال بعد ہمارے اِرد گرد کا ماحول نمایاں طور پر بہتر ہو سکتا ہے۔ ایک درخت شاید آج ہمیں چھوٹا سا قدم لگے، لیکن آنے والے برسوں میں وہ کسی بچے کے لیے سایہ، کسی پرندے کے لیے گھر اور کسی راہ گیر کے لیے سکون بن سکتا ہے۔ یہ بھی مت سوچیں کہ ماحولیاتی تبدیلی اتنی بڑی بلا ہے تو ہم اکیلے کیا کر سکتے ہیں۔ ہر بڑی تبدیلی چھوٹے قدموں سے شروع ہوتی ہے۔ شروعات ہمیشہ گھر سے ہوتی ہے۔ بلاضرورت پنکھا یا بلب بند رکھیے۔ بجلی کا استعمال سمجھ داری سے کیجیے۔ نلکا کھلا چھوڑ کر پانی ضائع نہ کیجیے۔ پلاسٹک کے غیر ضروری استعمال سے گریز کیجیے۔ ممکن ہو تو کپڑے کے تھیلے استعمال کیجیے۔ کچرا سڑکوں، نالوں یا کُھلے مقامات پر پھینکنے کے بجائے مناسب طریقے سے تلف کیجیے۔ اور اِس ستمبر اپنے حصے کا کم از کم ایک پودا ضرور لگائیے۔

ہماری یہ خوشی ہے کہ ریڈیو آج بھی گھر گھر، خاص طور پر ہمارے دیہات اور پہاڑی علاقوں تک آسانی سے پہنچتا ہے۔ ریڈیو کی سب سے بڑی طاقت یہی ہے کہ یہ لوگوں کے ساتھ براہِ راست ایک تعلق قائم کرتا ہے۔ ایسے وقت میں جب climate change ایک عالمی مسئلہ بن چکا ہے، ریڈیو awareness پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ بن سکتا ہے۔ ریڈیو کے توسط سے ہم اپنی مقامی زبانوں میں یہ پیغام عام کر سکتے ہیں کہ کسان بھائیوں کو بتایا جائے کہ بدلتے موسموں کے مطابق فصلوں کی حفاظت کیسے کی جا سکتی ہے، ماہرین سے پوچھا جائے کہ پانی کو محفوظ رکھنے کے لیے کیا اقدامات کیے جا سکتے ہیں، ڈاکٹروں سے معلوم کیا جائے کہ گرمی اور حبس میں صحت کا خیال کیسے رکھا جائے، اور نوجوانوں کو اپنے ماحول کے تحفظ کی مہم میں شامل کیا جائے۔

Climate change کی گفتگو میں مقامی لوگوں کی آواز بھی شامل ہونی چاہیے۔ ایک کسان جو کئی دہائیوں سے زمین پر کام کر رہا ہے، وہ موسم کی تبدیلی کو اپنے تجربے سے محسوس کرتا ہے۔ ایک بزرگ ہمیں بتا سکتا ہے کہ چند دہائیاں پہلے خزاں کس وقت آتی تھی اور بارش کا کیا معمول تھا۔ ایک نوجوان ہمیں بتا سکتا ہے کہ وہ اپنے شہر کو زیادہ green بنانے کے لیے کیا کر سکتا ہے۔ ایک اُستاد اپنے طلبہ کو ماحول کے بارے میں آگاہ کر سکتا ہے۔ ایک گھر کی خاتون پانی اور بجلی کے بہتر استعمال سے پورے خاندان کے رویے کو بدل سکتی ہے۔ یوں climate action کسی ایک ادارے یا حکومت کا کام نہیں رہتا بلکہ پوری community کی مشترکہ ذمہ داری بن جاتا ہے۔ میر پور کی کسی پُر سکون شام جب آپ منگلا جھیل کی طرف سے آنے والی ہلکی ہوا کو محسوس کریں، درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ سُنیں اور آسمان پر ڈوبتے سورج کے رنگ دیکھیں تو ایک لمحے کے لیے ضرور رکیں اور سوچیں کہ یہ خوبصورتی ہمیں قدرت نے مفت عطا کی ہے، لیکن اِسے محفوظ رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ موسم بدل رہا ہے اور ہمارے ساتھ ساتھ ہماری زمین کی طبیعت بھی بدل رہی ہے۔ شاید یہی وقت ہے کہ ہم قدرت کے ساتھ اپنے تعلق کو دوبارہ سمجھیں۔

آیئے اِس ستمبر عہد کریں کہ ہم پانی بھی بچائیں گے، درخت بھی لگائیں گے، بجلی کا استعمال بھی عقل مندی سے کریں گے اور اپنے اِرد گرد کے لوگوں کو بھی ماحول کی حفاظت کے بارے میں آگاہ کریں گے۔ ہم اپنے بچوں کو بتائیں گے کہ صاف ہوا، صاف پانی، درخت اور سبزہ صرف خوبصورتی نہیں بلکہ زندگی کی بنیادی ضرورت ہیں۔ کیونکہ بڑی تبدیلیاں ہمیشہ آسمان سے نہیں اُترتیں۔ وہ ہمارے آپ کے چھوٹے چھوٹے قدموں سے شروع ہوتی ہیں۔ ایک پودا، پانی کا ایک بچایا ہوا قطرہ، بجلی کا ایک بند کیا ہوا بلب، پلاسٹک کا ایک کم استعمال کیا ہوا تھیلا اور ماحول کے بارے میں ایک شخص کو دی گئی آگاہی، یہ سب بظاہر معمولی کام ہیں، لیکن یہی معمولی کام مل کر ایک بڑے فرق کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

ستمبر ہمیں ہر سال یاد دلاتا ہے کہ موسم بدلتے رہتے ہیں۔ خزاں آتی ہے، پتے جھڑتے ہیں، سردی آتی ہے اور پھر بہار نئی اُمید لے کر لوٹتی ہے۔ ہمیں بھی اِس قدرتی پیغام کو سمجھنا ہوگا۔ اگر ہم نے آج اپنے رویے تبدیل کیے، قدرتی وسائل کی قدر کی، درختوں کی حفاظت کی اور ماحول کو نقصان پہنچانے والی سرگرمیوں میں کمی لائی تو آنے والی نسلیں بھی اِن موسموں کی خوبصورتی سے لُطف اندوز ہو سکیں گی۔ اور اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو شاید آنے والے برسوں میں ستمبر کی یہ ٹھنڈی شامیں، خزاں کے یہ زرد پتے، منگلا جھیل کی یہ ہوا اور میر پور کی یہ ہریالی صرف ہماری یادوں کا حصہ بن کر رہ جائیں۔ اِس لیے آیئے، اِس ستمبر کو صرف خزاں کی آمد کا مہینہ نہ سمجھیں بلکہ اِسے ایک نئے عہد کا آغاز بنائیں۔ ایسا عہد جس میں ہم اپنی زمین کو صرف استعمال کرنے والی چیز نہیں بلکہ ایک امانت سمجھیں۔ ایسی امانت جو ہمیں اپنے بزرگوں سے ملی ہے اور جسے ہمیں اپنی آنے والی نسلوں تک اِسی خوبصورتی، زندگی اور اُمید کے ساتھ پہنچانا ہے۔ شاید یہی ستمبر کا اصل پیغام ہے کہ تبدیلی ناگزیر ہے، مگر یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہم اِس تبدیلی کا حصہ کیسے بنتے ہیں۔ ہم چاہیں تو اپنے چھوٹے چھوٹے اقدامات سے اپنے شہر کو زیادہ سرسبز، اپنے ماحول کو زیادہ صاف اور اپنے مستقبل کو زیادہ محفوظ بنا سکتے ہیں۔ اور پھر کسی آنے والی ستمبر کی شام، جب منگلا جھیل کے کنارے ہوا چلے، درختوں کے پتے سرسرائیں اور سورج آہستہ آہستہ پہاڑیوں کے پیچھے ڈوبے، تو ہماری آنے والی نسلیں بھی یہی کہہ سکیں کہ ستمبر واقعی جادو کا مہینہ ہے۔

بشکریہ ریڈیو آزاد کشمیر میر پور

اختر شیرانی: شاعرِ رومان کی خواب ناک دنیا

تحریر: ڈاکٹر طارق ہاشمی
پروفیسر شعبۂ اُردو اور مشرقی زبانیں،
جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

ذرا تصور کیجیے۔۔۔ایک ایسی دنیا، جہاں چاندنی راتیں ہیں، بہار کی خوشبو ہے۔۔۔۔دور کسی وادی میں آبشار گرتی ہے، ہوا کے دوش پر کسی محبوب کا نام تیر رہا ہے اور ایک شاعر، دنیا کی ہنگامہ خیز حقیقتوں سے دُور، محبت کے کسی خواب میں گم ہے۔ یہ دنیا اختر شیرانی کی دنیا ہے۔

اُردو شاعری میں بعض نام محض نام نہیں رہتے، ایک پوری کیفیت بن جاتے ہیں۔ میر کا ذکر ہو تو دل پر اُداسی اترتی ہے، غالب یاد آئیں تو ذہانت اور شوخیِ فکر کا احساس ہوتا ہے، اقبال کا نام آئے تو فکر و عمل کی ایک وسیع دنیا سامنے آتی ہے، فیض کا ذکر ہو تو عشق کے ساتھ انقلاب کی صدا سنائی دیتی ہے۔۔۔ لیکن اختر شیرانی کا نام آتے ہی فضا بدل جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے جوانی، حُسن، محبت، بہار، چاندنی، تنہائی اور خوابوں کی ایک ایسی دنیا آباد ہونے لگتی ہے جس میں اداسی بھی ہے تو دل نشیں، اور تنہائی بھی ہے تو محبت کی یاد سے روشن۔ یہی اختر شیرانی ہیں۔۔۔اُردو کے شاعرِ رومان، جنہوں نے محبت کو صرف ایک جذبے کے طور پر نہیں، بلکہ اپنی پوری شعری کائنات کے طور پر محسوس کیا اور اُسے لفظوں میں ایک ایسی خواب ناک فضا عطا کی جو آج بھی اپنے سحر میں گرفتار کر لیتی ہے۔

اختر شیرانی اُردو کے اُن شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے عشق کو اپنی پوری شعری شخصیت کا بنیادی حوالہ بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہیں اُردو کا شاعرِ رومان کہا گیا۔ اُن کی رومانیت میں ایک پوری جمالیاتی دنیا آباد ہے، ایسی دنیا جہاں انسان اپنے روز مرہ کے دُکھوں، سماجی اُلجھنوں اور زندگی کی سختیوں سے نکل کر محبت اور حُسن کے ایک خواب ناک جزیرے میں پناہ لیتا ہے۔

محبت کے لیے آیا ہوں میں دُنیا کی محفل میں
محبت خون بن کر لہلہاتی ہے مرے دل میں
محبت ابتدا میری، محبت انتہا میری
محبت سے عبارت ہے بقاء میری فنا میری
محبت ہی مرے نزدیک معراجِ عبادت ہے
محبت ہی مرے نزدیک سرتاجِ عبادت ہے

اختر شیرانی کا اصل نام محمد داؤد خان تھا۔ وہ 4 مئی 1905ء کو ریاست ٹونک، راجستھان میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد حافظ محمود خان شیرانی اُردو کے ممتاز محقق، عالم اور ماہرِ لسانیات تھے۔ گھر میں علم و ادب کا گہرا ماحول تھا۔ والد چاہتے تھے کہ بیٹا بھی علم و تحقیق کی دنیا میں نام پیدا کرے، مگر داؤد خان کی طبیعت نے ایک مختلف راستہ اختیار کیا۔ اُن کے اندر شاعر پہلے سے موجود تھا؛ سو وہ تحقیق کی خشک راہوں کے بجائے تخیل، حُسن اور شاعری کی سرسبز وادیوں کی طرف نکل گئے۔ اختر شیرانی کی شخصیت کا ایک دلچسپ پہلو سامنے آتا ہے۔ اُن کے والد اُردو کے سنجیدہ محقق تھے، جبکہ بیٹے نے اُردو شاعری میں جذبے اور تخیل کی دنیا آباد کی۔ ایک ہی گھر میں اُردو ادب کی دو مختلف مگر اہم روایتیں پروان چڑھیں: ایک طرف تحقیق اور علم، دوسری طرف رومان اور شاعری۔ یوں اختر شیرانی کی شخصیت کو اُن کے علمی خانوادے سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں۔

اختر شیرانی کی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں گزرا۔ صحافت اور ادبی رسائل سے بھی اُن کا تعلق رہا اور اُنہوں نے مختلف رسائل کی ادارت کی۔ اُس زمانے کا لاہور اُردو ادب کا ایک اہم مرکز تھا۔ مشاعرے، ادبی نشستیں، رسائل اور کتابیں ایک زندہ ادبی ماحول تشکیل دے رہے تھے۔ اختر شیرانی اِسی ماحول میں اپنی مخصوص آواز کے ساتھ سامنے آئے اور بہت جلد اُن کی شناخت ایک ایسے شاعر کی



حیثیت سے قائم ہو گئی جس کے ہاں عشق اور حُسن نے ایک نئی شعری زبان اختیار کی۔ اُن کے شعری مجموعوں میں "اخترستان"، "شعرستان"، "شہناز"، "صبحِ بہار"، "طیورِ آوارہ" اور "لالہ طور" کے نام نمایاں ہیں۔ اِن عنوانات ہی میں ایک پوری رومانوی فضا محسوس کی جا سکتی ہے۔۔۔ یہ سب عنوانات شاعر کے تخیل، فطرت اور رومانوی مزاج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اختر شیرانی کا زمانہ اُردو شاعری میں بڑی تبدیلیوں کا زمانہ تھا۔ اقبال کی فکری شاعری اپنے اثرات قائم کر چکی تھی، جوش ملیح آبادی کی آواز بلند ہو رہی تھی اور آگے چل کر ترقی پسند تحریک نے اُردو شاعری کو سماجی اور سیاسی شعور سے جوڑ دیا۔ ایسے ماحول میں اختر شیرانی نے ایک مختلف راستہ اختیار کیا۔ اُنہوں نے سیاست کے ہنگامے کے بجائے انسان کے دل کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا۔ یہی بات بعض اوقات اُن کی کمزوری کے طور پر بھی پیش کی گئی، لیکن اِسے اُن کی شعری شناخت کی قوت بھی کہا جا سکتا ہے۔ شاعر کا کام صرف اپنے زمانے کے سیاسی مسائل بیان کرنا نہیں؛ انسانی احساسات کی ایسی کیفیتوں کو زبان دینا بھی شاعری کا کام ہے جو ہر عہد میں زندہ رہتی ہیں۔ محبت، انتظار، جدائی، حُسن، تنہائی اور یاد یہ وہ موضوعات ہیں جو زمانہ بدلنے کے باوجود انسان کے ساتھ رہتے ہیں۔

اختر شیرانی کی رومانی نظموں میں سلمیٰ، عذرا، ریحانہ اور شہناز جیسے نام بار بار آتے ہیں۔ یہ نام اُن کی شاعری میں محض افراد کے نام نہیں رہتے بلکہ ایک رومانوی تخیل کی علامت بن جاتے ہیں۔ اُن کے ذریعے شاعر ایک ایسے حُسن کو مجسم کرتا ہے جسے وہ حاصل کرنے سے زیادہ محسوس اور تصور کرنا چاہتا ہے۔ اختر شیرانی اُردو کی کلاسیکی شعری روایت سے جڑے ہوئے بھی ہیں اور اِس سے مختلف بھی۔ کلاسیکی غزل میں محبوب اکثر بے نام ہوتا ہے؛ شاعر اُس کے حُسن اور ستم کا ذکر کرتا ہے مگر اُس کی شناخت ایک پردے میں رہتی ہے۔ اختر شیرانی نے محبوب کو نام دے کر اُسے اپنی نظم کے زیادہ قریب کر دیا۔ "سلمیٰ"، "عذرا" اور "ریحانہ" اِس اعتبار سے محض کردار نہیں بلکہ اختر کی شعری دنیا کے مرکزی استعارے ہیں۔

وہ روتی ہے تو ساری کائنات آنسو بہاتی ہے
وہ ہنستی ہے تو فطرت بے خودی سے مسکراتی ہے
وہ سوتی ہے تو ساتوں آسماں کو نیند آتی ہے
وہ اُٹھتی ہے تو کل خوابیدہ دنیا کو اُٹھاتی ہے

اختر شیرانی کی نظم "اے عشق کہیں لے چل" اُن کے رومانوی مزاج کی شاید سب سے جامع ترجمانی کرتی ہے۔ شاعر عشق سے کہتا ہے کہ اُسے اِس دنیا سے کہیں دُور لے چلے؛ ایسی جگہ جہاں نفرت، مکر اور جھانہ ہو، جہاں غم کی رسائی نہ ہو، جہاں انسان اپنی اصل خوب صورتی کے ساتھ زندہ

ہو سکے۔ یہاں عشق ایک فرار کا راستہ بھی ہے اور ایک مثالی دنیا کی تلاش بھی۔ شاعر موجودہ دنیا سے مطمئن نہیں؛ وہ ایک ایسی دنیا چاہتا ہے جو محبت، حُسن اور انسانی پاکیزگی پر قائم ہو۔ چنانچہ اختر کا عشق محض محبوب تک پہنچنے کی خواہش نہیں رہتا بلکہ ایک بہتر اور حسین دنیا کی آرزو بن جاتا ہے۔ مقابل وہ ایک ایسی فضا کا خواب دیکھتا ہے جہاں عشق کی حکمرانی ہو۔ یہی خواب اختر شیرانی کی شاعری کا بنیادی مزاج ہے۔

اے عشق ہمیں لے چل اِک نور کی وادی میں
اِک خواب کی دنیا میں اِک طور کی وادی میں
حوروں کے خیالاتِ مسرور کی دنیا میں
تا خلدِ بریں لے چل!
اے عشق کہیں لے چل!

اختر شیرانی کی شاعری میں فطرت بھی اِسی رومانوی دنیا کا حصہ ہے۔ چاندنی راتیں، بہار، گھٹائیں، پہاڑ، وادیاں، ستارے، ہوا، پھول اور خوشبو۔ یہ سب اُن کے شعری پیکر میں بار بار آتے ہیں۔ لیکن فطرت اُن کے ہاں محض منظر نگاری نہیں کرتی؛ وہ انسانی جذبات کی ترجمان بن جاتی ہے۔ بہار آئے تو دل میں بھی بہار آتی ہے، چاندنی پھیلے تو محبوب کی یاد روشن ہو جاتی ہے، وادی سامنے آئے تو ماضی کی کوئی داستان جاگ اُٹھتی ہے اور تنہائی کا منظر کسی بھولی ہوئی محبت کی تصویر بن جاتا ہے۔ اِس طرح اختر کے ہاں خارجی فطرت اور داخلی کیفیت ایک دوسرے میں گھل جاتی ہیں۔

جہاں رنگیں کھیلتی ہیں سبزہ زاروں میں
جہاں حوروں کی زلفیں جھومتی ہیں شاخساروں میں
جہاں پریوں کے نغمے گونجتے ہیں کوہساروں میں
جوانی کی بہاریں تیرتی ہیں آبشاروں میں
مری سلمیٰ مجھے لے چل تو اُن رنگیں بہاروں میں!

اختر شیرانی کی شاعری کا ایک بڑا وصف اُس کی موسیقیت ہے۔ اُن کے اشعار پڑھتے ہوئے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ شعر محض پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ گانے کے لیے بھی بنا ہے۔ لفظوں کا انتخاب، مصرعوں کی روانی، صوتی آہنگ اور تکرار اُن کے ہاں ایک ایسی نغمگی پیدا کرتے ہیں جو براہِ راست سماعت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اُن کے اشعار میں آواز کے لیے جگہ ہے۔ اُن کے مصرعے اپنی داخلی موسیقیت کے باعث ادائیگی میں کھلتے ہیں۔ ایک خوب صورت آواز جب اُن کی نظم پڑھتی ہے تو الفاظ کے ساتھ ساتھ ایک پورا منظر بھی تخلیق ہونے لگتا ہے۔ اختر شیرانی نے اپنی نظموں میں ایسی زبان اختیار کی جو سادہ، نرم، مترنم اور جذباتی ہے۔ یہی سادگی اُن کی مقبولیت کا ایک سبب بنی۔ وہ پیچیدہ فلسفیانہ مقدمات قائم نہیں کرتے؛ وہ ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں اور قاری یا سامع کو اِس کیفیت میں شریک کر لیتے ہیں۔

نوائے زہرہ گم ہے تیرے نغموں کی فضاؤں میں
نزاکت سیکھتا ہے خندہ حورِ جناں تجھ سے
اُفق پر صبح کی پہلی کرن جب مسکراتی ہے
سبق لیتی ہے بیداری کا روحِ گلستاں تجھ سے

اختر شیرانی کے ہاں شباب ایک اہم جمالیاتی قدر ہے۔ اِسے عالمِ شباب میں پوری دنیا ایک ایسے لمحے میں منجمد دکھائی دیتی ہے جسے شاعر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لینا چاہتا ہے۔ مگر یہی وہ مقام ہے جہاں اختر شیرانی کی شاعری ایک ہلکی سی اُداسی بھی پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ ہر بہار کے پیچھے خزاں موجود ہے، ہر ملاقات کے پیچھے جدائی کا امکان، ہر جوانی کے پیچھے زوال اور ہر خوشی کے پیچھے وقت کی بے رحمی۔ اِس لیے اُن کی رومانیت محض مسرت کی شاعری نہیں؛ اُس کے اندر زوال اور محرومی کا احساس بھی مسلسل موجود ہے۔ یہی کیفیت اُن کی بعض غزلوں میں بھی نمایاں ہوتی ہے:

اے دل! وہ عاشقی کے فسانے کدھر گئے
وہ عمر کیا ہوئی، وہ زمانے کدھر گئے

اختر شیرانی کی شخصیت اور شاعری کا سب سے خوب صورت پہلو شاید یہی ہے کہ اِن دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔ اُن کی شاعری میں جو خواب ہے، وہ اُن کی شخصیت کا بھی حصہ ہے؛ جو حُسن ہے، وہ اُن کے تخیل کا بھی حُسن ہے؛ جو تنہائی ہے، وہ اُن کے اشعار کی بھی تنہائی ہے اور جو عشق ہے، وہ اُن کے فن کا بھی مرکزی جذبہ ہے۔ وہ محبت کو شاعری میں ایک مکمل جمالیاتی تجربہ بنانے والے شاعر ہیں۔ محبت، خواب، حُسن اور جوانی کے اِس شاعر کی زندگی مگر زیادہ طویل نہ تھی۔ 9 ستمبر 1948ء کو لاہور میں اختر شیرانی کی زندگی کا چراغ بجھ گیا۔ عمر صرف تینتالیس برس تھی۔ یوں جس شاعر نے اپنی شاعری میں جوانی کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لینے کی کوشش کی تھی، وہ خود وقت کی بے رحمی سے بہت جلد رُخصت ہو گیا۔ مگر بعض آوازیں موت کے ساتھ خاموش نہیں ہوتیں، وہ اپنے لفظوں میں زندہ رہتی ہیں۔ اختر شیرانی بھی ایسی ہی ایک آواز ہیں۔ آج بھی اُن کا نام آتا ہے تو اُردو شاعری میں ایک خواب ناک منظر اُبھرنے لگتا ہے۔۔۔ ایک ایسا منظر جس میں دل میں اُترنے والی روشنی ہے۔۔ ایک ایسی روشنی جس میں جوانی کا خواب بھی ہے، محبت کی کسک بھی، جدائی کی اُداسی بھی اور حُسن کی وہ دنیا بھی، جسے شاعر نے لفظوں میں ہمیشہ کے لیے آباد کر دیا۔۔۔ اور پھر، جیسے دُور کسی وادی سے کسی شاعر کی آواز آتی ہو۔۔۔ ہم بھی اِسی آواز کے ساتھ رُخصت ہوتے ہیں:

اے عشق! کہیں لے چل!

بشکریہ پی بی سی فیصل آباد

ڈاکٹر وزیر آغا

ایک ہمہ جہت شخصیت

تحریر: یوسف خالد



راولپنڈی صدر میں ہر اتوار پرانی کتابیں اور رسالے فٹ پاتھ کی زینت بنتے تھے۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ میں چھٹی کا دن اُن کتابوں کے ساتھ گزاروں اور اپنی پسند کی کتابیں تلاش کروں۔ اُن دنوں مجھے انسانی نفسیات اور اِس سے جڑے موضوعات میں بہت دلچسپی تھی۔ ایک کتاب پر میری نظر پڑی جس پر لکھا تھا "مسرت کی تلاش" مصنف کا نام وزیر آغا لکھا تھا۔ میں نے اُس کتاب میں شامل مضامین کی فہرست دیکھی اور کتاب خرید لی۔ یہ کتاب وزیر آغا سے میری پہلی غائبانہ ملاقات کا ذریعہ بنی۔ یہ 1973ء کی بات ہے۔ یہ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا، میں اُس وقت تک وزیر آغا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔

ہمارے ایک بہت پیارے دوست ایم ڈی شاد تھے جو پیشہ کے اعتبار سے وکیل تھے لیکن علمی و ادبی محافل میں شرکت کرنا اور شاعروں ادیبوں سے ملنا جلنا اُنہیں بہت پسند تھا۔ آغا جی جب بھی سرگودھا تشریف لاتے تو اِس کی اطلاع ایم ڈی شاد کو پہلے سے کر دیا کرتے تھے تاکہ وہ دوستوں کو آغا جی کی آمد کا بتا دیں۔ آغا جی کی آمد پر 58 سول لائن سرگودھا میں احباب مل بیٹھتے تھے۔ یہ آغا جی کی رہائش گاہ بھی تھی اور علم و ادب کا مرکز بھی۔

آغا جی مہینے میں ایک دو بار یہاں آتے تھے اُن کا بیشتر وقت وزیر کوٹ میں گزرتا تھا۔ وہ ایک انتہائی کامیاب اور ذہین زمیندار تھے۔ اُنہیں اپنے گاؤں میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ شاید اِس لیے کہ اُنہیں وہاں فطرت کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملتا تھا اور یکسوئی بھی میسر آتی تھی جو تخلیقی سرگرمیوں کے لیے بہت ضروری ہوا کرتی ہے۔

آغا جی کے ساتھ میرا تعلق ادب کے علاوہ بطور زمین دار بھی تھا۔ میں اِس حوالے سے اُن سے رہنمائی لیتا تھا۔ میرا زرعی رقبہ آغا جی کے گاؤں سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ فیصل آباد روڈ پر 46 آڈہ سے کچھ آگے ایک نہر گزرتی ہے جو میری اور آغا جی کی زمینوں کو سیراب کرتی ہے۔ فیصل آباد سڑک کے ایک جانب وزیر کوٹ میں آغا جی کا رقبہ ہے تو دوسری جانب چک 47 جنوبی میں میرا رقبہ ہے۔ میری بہت سی ملاقاتیں اُن سے اُن کے گاؤں میں بھی ہوتی تھیں اُن سے گھنٹوں علم و ادب کے ساتھ ساتھ باغات کی دیکھ بھال اور دیگر فصلوں کے حوالے سے گفتگو ہوتی تھی۔ آغا جی ایک کامیاب کاشتکار تھے۔ میں نے محکمۂ زراعت کے بہت سے سینئر افسروں کو اُن سے مشورے لیتے دیکھا ہے۔ آغا جی کے کینو کے باغات تھے اور اِس حوالے سے وہ پاکستان بھر میں ایک خاص شہرت رکھتے تھے۔ باغات خریدنے والوں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اِن کے باغات کا سودا کریں تاکہ اعلیٰ معیار کا کینو اُنہیں ملے اور وہ اِسے بہتر قیمت پر بیچ سکیں۔ میں اکثر کینو کی بیماریوں، اُن کے علاج اور کھاد وغیرہ کے حوالے سے اُن سے رہنمائی حاصل کرتا تھا۔ مجھے آغا جی کہا کرتے تھے کہ میں ہر صبح جب باغ کی سیر کو نکلتا ہوں تو پودے، درخت، گھاس اور پرندے مجھ سے باتیں کرتے ہیں اور اگر میں اپنی علمی و ادبی اور دیگر مصروفیات کی وجہ سے کچھ دنوں کے لیے گاؤں سے باہر کہیں جاتا ہوں تو اِن سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ واپسی پر دوبارہ جب بھی باغ کی روشوں پر چہل قدمی کرتا ہوں تو پورا باغ اور اِس کے باسی مجھ سے شکایت کرنے لگتے ہیں کہ آپ اتنے دن کہاں تھے۔

میں نے آغا جی کی گفتگو سے متعدد بار اُن کی پھولوں، پودوں، درختوں اور پرندوں سے وابستگی کو پوری طرح محسوس کیا ہے۔ وہ جو کہتے تھے وہ اُن کی گہری وابستگی کا اظہار تھا۔

مجھے آغا جی کو بہت قریب سے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اُن کی زندگی کے معمولات، عادات اور مصروفیات دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا تھا کہ وہ اپنی شخصیت میں ایک پورا سماجی اور تہذیبی جہان آباد کیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش، اپنی تہذیب اور اپنے سماج سے نہ صرف پوری طرح جڑے ہوئے تھے بلکہ اِس حوالے سے ایک مربوط نظامِ فکر کے حامل تھے۔

اُن کی تحریریں جہاں اُن کے نظامِ فکر اور تصورات کا بین حوالہ ہیں وہاں اِن تحریروں میں اُن کے شخصی وقار، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور حُسنِ معاشرت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ وہ انتہائی وسیع المطالعہ شخص تھے۔ اُن کا مشاہدہ بہت قوی تھا۔ وہ کسی بھی منظر کو سرسری نہیں دیکھتے تھے بلکہ اُس کی تمام جزئیات کو پوری طرح اپنے نظامِ فکر کا حصہ بناتے اور اپنی تخلیقات میں شامل کرتے تھے۔

ایک دن ہم کچھ دوست اُن سے ملنے وزیر کوٹ گئے۔ راستہ سڑک کی مرمت کے باعث جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ گاڑی کی رفتار بہت کم رکھنا پڑتی تھی۔ ہمارے آگے ایک روڈ رولر سڑک کو ہموار کرنے کی مشقت جھیل رہا تھا۔ ہم گرد و غبار سے گزر کر آغا جی کے ہاں پہنچے اور پھر دیر تک اُن کی مہمان نوازی اور علمی و ادبی گفتگو اور دانش سے فیض یاب ہوئے اور واپسی پر پھر اُسی رہگزر کے پیچ و خم اور دشواریوں کو جھیلتے سرگودھا پہنچے۔

ڈاکٹر صاحب جب کبھی سرگودھا آتے تو اُن کے ہاں خوب محفل جمتی۔ پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور سجاد نقوی کو لانے کے لیے آغا جی ڈرائیور (باؤ) سے کہتے اور وہ اُنہیں آغا جی کے پاس لے کر جیسے ہی پہنچتا، ایک خوبصورت دن اور مجلس آرائی کا آغاز ہو جاتا۔

مجھ خاکسار سمیت ڈاکٹر سلیم آغا، جناب یونس خیال، محترمہ نجمہ منصور، جناب ذوالفقار احسن، جناب عابد خورشید اور ایم ڈی شاد اکثر اُن مجالس میں شریک ہوتے تھے جناب پرویز بزمی، صوفی فقیر محمد اور عصمت علیگ بھی کبھی کبھی تشریف لاتے تھے۔

آغا جی کے ہاں جناب ممتاز عارف، جناب آصف راز، جناب اخلاق عاطف، جناب ہارون الرشید تبسم، منزہ انور گوئندی اور دیگر بہت سے دوست بھی اپنی سہولت اور وقت میسر آنے پر تشریف لاتے۔ یوں شام تک بہت سے موضوعات پر غیر رسمی گفتگو ہوتی رہتی۔

اِن محفلوں میں بعض اوقات آغا جی سے اُن کی کوئی تازہ نظم یا انشائیہ بھی سنا جاتا اور پھر اِس حوالے سے فکر انگیز اور پُر لطف گفتگو ہوتی۔ یہ محفلیں انشائیہ فہمی اور جدید نظم کی تفہیم کے حوالے سے نئے لکھنے والوں کے لیے بہت اہمیت کی حامل تھیں۔

ہماری وزیر کوٹ کی یاترا کے کچھ دن بعد جب آغا جی سرگودھا تشریف لائے تو حسبِ روایت دوست اکٹھے ہوئے۔ اِس بار آغا جی نے کہا میں نے ایک نیا انشائیہ لکھا ہے وہ آپ دوستوں کو سناتا ہوں۔

انشائیہ کا عنوان ہے "روڈ رولر" - جیسے ہی آغا جی نے نام کا اعلان کیا تو کچھ روز پہلے کا سارا منظر ہمارے سامنے آگیا- ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ روڈ رولر جسے دیکھ کر ہم اُکتاہٹ کا شکار ہوئے تھے، اُسے آغا جی نے اپنے انشائیے میں کس کس انداز سے دیکھا اور اس بے ڈھب ہاتھی نما جثے کو کیسی کیسی صورتیں عطا کر دیں- جن دوستوں نے یہ انشائیہ پڑھا ہے وہ اِس واقعے کا لطف اٹھا سکتے ہیں-

بعد میں جب اُن کے انشائیوں کا مجموعہ چھپا تو اُس کا نام اُنہوں نے "پگڈنڈی سے روڈ رولر تک" رکھا - یہ نام اُن کے انشائیوں میں در آنے والے فکری ارتقائی سفر کا حوالہ بھی ہے کہ پگڈنڈی بھی اُن کا ایک شاہکار انشائیہ ہے- اِن دونوں انشائیوں کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ آغا جی کے فکری سفر کی داستان ہے-

انشائیہ پگڈنڈی کا آغاز اِس مقولے سے ہوتا ہے "راہِ راست بر و گرچہ دور است" آغا جی کو اُن کے استادِ محترم یہ مقولہ سناتے ہوئے کہتے تھے کہ

"بیٹا! یادر کھو زندگی کی ساری کامیابی سیدھی سڑک اختیار کرنے میں ہے"۔

روڈ رولر تک پہنچتے پہنچتے اِس مقولہ کی سچائی کی کئی پرتیں آغا جی پر کھلیں-

آغا جی نے روڈ رولر کے ڈرائیور سے روڈ رولر پر سوار ہونے کی خواہش کا اظہار کیا اور پھر تقریباً دو گھنٹے اُس کے ساتھ سفر کیا- اِس سفر میں اُن پر زندگی کے کیا کیا اسرار کُھلے اُس تجربے کو بیان کرتے ہوئے انشائیہ کی آخری سطریں یوں تحریر کرتے ہیں:

"اب میرے لیے روڈ رولر "ہست" کا ایک انگ نہیں تھا بلکہ بجائے خود ایک خود مختار، سدا بہار، دھڑکتی اور سانس لیتی ہوئی "موجودگی" کا مظہر تھا- تب میں سوچنے لگا کہ ہر خواہش کے اندر ایک خلا ہوتا ہے جسے وہ باہر کے وجود سے بھر لینا چاہتی ہے اور جب اِسے بھر لیتی ہے تو اُس کا سانس رک جاتا ہے اور وہ مر جاتی ہے مگر روڈ رولر تو اندر سے خالی نہیں ہے- یہ تو ایک گھٹا ہوا، ٹھوس، ہر اعتبار سے ایک بھرپور وجود ہے- پھر اِسے "باہر" کی کسی شئے کی بھلا کیا ضرورت ہے؟- یہ ایک عجیب سا احساس تھا اور پھر یکایک میرے سینے کا خلا غبارے کی طرح پھول کر ایک ہمکتی ہوئی خواہش میں تبدیل ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ کاش! میں بھی ایک روڈ رولر ہوتا"۔

آغا جی کی فکر کے سارے دھارے فطرت کی رعنائیوں اور بوقلمونیوں سے جڑے ہوئے ہیں- آغا جی کا معمول تھا کہ وہ علی الصبح حویلی کے بڑے سے کمرے میں جو خاصا کشادہ ہے جس کی چھت بھی کم و بیش 20 فُٹ بلند ہے اور کتابوں سے بھرا ہوا ہے، میں اپنا وقت پڑھنے لکھنے اور غور و فکر کرنے میں گزارتے تھے- دن نکلنے تک وہ یکسو ہو کر اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں مشغول رہتے اور پھر اُس کے بعد سیر کو نکلتے، اور فطرت سے ہمکلام ہوتے- آغا جی ایک داخلی نظم و ضبط کے تحت طے شدہ اہداف کے حصول کے لیے اپنا وقت صَرف کرتے تھے اور ایک ایک لمحے سے خراج وصول کرتے تھے- اُن کا انہماک اور فکری مراقبہ بہت توانا تھا- جب وہ اپنے کمرے میں ہوتے تو دنیا جہان سے کٹ جاتے اور اپنے تخلیقی رزق کو سمیٹتے اور پھر اُسے کسی شہ پارے میں منتقل کر دیتے-

ایک دفعہ اُنہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ اُنہیں حکومت کی جانب سے ایک انتہائی اہم موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرنے کا کہا گیا- اُن کا پسندیدہ موضوع تھا اور اُنہیں اِس پر مزید پڑھنے اور سوچ بچار کرنے کا موقع میسر آیا تو اُنہوں نے اپنے ملازم کو کہا کہ مجھے بروقت ناشتہ دینے اور نائی سے شیو کروانے کے علاوہ کوئی مجھے ملنے نہ آئے- کہتے ہیں میں اپنے کام میں مصروف تھا کہ میری نظر گھڑی پر پڑی، میں نے فوراً ملازم کو آواز دی،

میں نے کہا تھا ناں کہ مجھے ناشتہ بروقت دیا جائے اور نائی میری شیو بھی بروقت بنائے- اب کتنا وقت ہو گیا ہے مجھے ناشتہ دیا گیا ہے نہ ہی نائی نے میری شیو کی ہے- ملازم نے ڈرتے ڈرتے کہا آغا جی آپ کی شیو ہو چکی ہے اور آپ ناشتہ بھی کر چکے ہیں- مجھے یہ جان کر حیرت بھی ہوئی اور کچھ شرمندگی بھی کہ میں نے ناحق ملازم کو ڈانٹا- کہتے ہیں میں نے ملازم کو پاس بلایا، اُسے کچھ پیسے دیئے اور کہا کہ اِس واقعہ کا کسی کو مت بتانا-

آغا جی کا یہ انہماک افسانہ نہیں- میں نے اُنہیں متعدد بار کچھ لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر کے کسی گہری سوچ میں نیند جیسی کیفیت میں مبتلا دیکھا ہے- آغا جی کو اپنی توجہ کو کسی بھی وقت کسی بھی نقطے پر مرکوز کرنے کا ہنر آتا تھا- اُن کی اِس خوبی نے اُنہیں اپنی تخلیقی توانائیوں کو بہتر انداز میں استعمال کرنے کا سلیقہ عطا کیا، انسانی نفسیات میں توجہ کتنی قوت کی حامل ہے یہ صاحبانِ علم جانتے ہیں-

آغا جی نے اپنی زندگی کو ایک خاص ڈھب سے گزارا- وہ سمجھتے تھے کہ ہر گزرتا لمحہ اپنے دامن میں ہمارے لیے بہت کچھ لیے ہوئے ہوتا ہے- ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہماری جستجو اور لگن میں کسی طور کمی واقع نہ ہو-

آغا جی کی تحریروں میں تمثیل نگاری اور جزئیات نگاری اُن کے عمیق مشاہدے اور کامل انہماک کی وجہ سے ہی ہے- اُن کے اسلوب کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ جس بھی موضوع کی گرہیں کھولتے ہیں اُس کے سارے پہلوؤں کو پہلے سوالات کی صورت اپنے سامنے رکھتے ہیں (ایک قاری کی طرح) اور پھر اُن سوالات کے جوابات ایسے سہل اور قابلِ فہم انداز میں تحریر کرتے ہیں کہ ادق سے ادق موضوع کی بھی تفہیم ہو جاتی ہے- اِس حوالے سے اُن کی کچھ کتابیں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں "ساختیات اور سائنس، دستک اُس دروازے پر، تنقید اور احتساب، اُردو شاعری کا مزاج، تخلیقی عمل، معنی اور تناظر، غالب کا ذوقِ تماشہ اور تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں"۔

اِن کتابوں میں جن موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے وہ گہرے فکر سے جڑے ہوئے ہیں- آغا جی کا بات سمجھانے کا انداز اور اسلوب اتنا دلکش اور عام فہم ہے کہ مشکل سے مشکل بات بھی آسان محسوس ہونے لگتی ہے، جس کسی نے اُنہیں پڑھا وہ اُن کا گرویدہ ہو گیا-

آغا جی کی ہمہ جہت شخصیت کے دونوں پہلو یعنی سماجی شخصیت اور علمی و تخلیقی شخصیت انتہائی تابناک اور ایک دلپذیر تہذیب کا حوالہ ہیں- آغا جی نے اپنی تحریروں سے ایسی فکری تحریک کی بنیاد رکھی جس نے ایک پورے عہد کو اپنی دانش کیا-

58 سول لائن وہ ادبی مرکز تھا جہاں سے اُردو ادب کی جدید ترین تحریکوں کو فکری غذا میسر آتی رہی اِسی مرکز میں سرگودھا رائٹرز کلب کے اجلاس ایک عرصہ تک جاری رہے- سید مرتضیٰ حسن جو سرگودھا رائٹرز کلب کے اُس آخری دور میں سیکریٹری تھے، وہ یہاں بہت بھرپور اجلاس باقاعدگی کے ساتھ منعقد کرتے رہے اور یوں یہ علمی مرکز علم و ادب کے فروغ میں مزید فعال ہوا اور آغا جی کی زندگی تک اِس کے اجلاس تواتر سے ہوتے رہے- بہت سے اجلاس میں آغا جی، سلیم آغا، سجاد نقوی، صاحبزادہ عبدالرسول، پروفیسر غلام جیلانی اصغر اور دیگر بہت سے دوست شرکت کرتے رہے- 58 سول لائن کے انہدام کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری و ساری ہے کہ کہانی کبھی رکتی نہیں-



آخر میں آغا جی کے نام ایک نظم

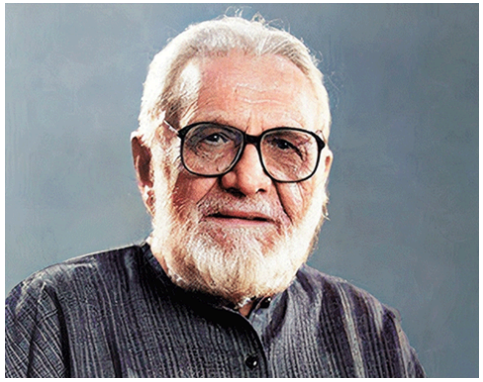
نابغۂ عصر
فطرت نے امکانات کے رنگوں
اور صورت گری کے امکانات کو
زاویوں، قوسوں اور لکیروں کی صورت
ایک بہت بڑے کینوس پر
اپنے موقلم سے
چشمِ حیرت کے لیے آویزاں کر دیا ہے
فطرت نے
بہتے پانیوں، پُر ہول جنگلوں، سنگلاخ پہاڑوں، سمندروں اور صحراؤں کی وسعت میں
اور دھرتی کی نرم پوروں میں
فکری و تخلیقی رزق کے بیج بکھیر دیے ہیں
رات کے پچھلے پہر صدا آتی ہے
ہے کوئی جو دیکھے، سوچے اور سمجھے
اِس صدا پر لبیک کہنے والے کم کم ہیں
لیکن کچھ مہمان کردار ہیں
جو نا گفتنی کو گفتنی
اور اَن دیکھے کو دیکھے ہوئے منظر کا روپ دینے اور
پردہ در پردہ حیرت کے عقب میں موجود دُھند سے آگہی کشید کرنے کا کشٹ کرتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں
جو فطرت کے کارِ نمو پزیری میں شریک ہو کر
اپنی بصارت، بصیرت اور فکری ریاضت سے نئے جہانوں کی چہرہ کشائی کرتے ہیں
نسلِ انسانی کا تہذیبی ارتقاء اُنہیں کے رتجگوں کا مرہون ہے
اُنہیں کی معجز نمائی سے دھرتی اپنا بانجھ پن تج کر کے مسکراتی ہے
صدیاں اُنہیں کی آستانہ بوسی سے معتبر ہوتی ہیں
وقت اُنہیں کے کارہائے نمایاں کی باز آفرینی کا طلب گار رہتا ہے
تاریخ کے اوراق اُنہیں کی حیات افروز سوچوں سے ہیں
آغا جی آپ ایسے ہی نابغہ تھے
آپ کی فکری ریاضت، تخیل، علم پرور انہماک
اور آپ کی تمثال کاری نے شعور و آگہی کے نئے دبستان کی بنیاد رکھی

ہم آپ کے لفظوں کی چھاگل سے اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں
اپنی کم مائیگی کو وسعت آشنا کرنے کا جتن کرتے ہیں
آغا جی
ہم آپ کے چمن زارِ خیال کی راہداریوں میں چہل قدمی کرتے ہیں،
آپ کی فکری دانش، لہجے کی مٹھاس
اور شخصیت کی تہذیبی خوشبو سے ہم رشتہ رہتے ہیں
ہم آپ کو نہیں بھولے
مگر ہم یہ اعتراف کرتے ہیں
کہ ہم نے آپ کی علمی و فکری یافت کی پزیرائی کا حق ادا نہیں کیا
آپ کے رتجگوں کی توقیر نہیں کی
ہمیں ابھی یہ قرض ادا کرنا ہے
نہ جانے کتنی صدیاں لگ جائیں
سچ یہ ہے کہ
صدیاں تسخیر کرنے والوں کی تحسین کبھی مکمل نہیں ہوتی
آغا جی
ہم آپ کے مقروض ہیں

بشکریہ پی بی سی سرگودھا

داستان گو: اشفاق احمد

تحریر: ریاض محمود



یہ پرانے براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی بات ہے۔ سردیوں کے دن تھے۔ ایک روز پہلے برسنے والی بارش نے ٹھنڈ میں مزید اضافہ کر دیا تھا، اگرچہ دھوپ نکلی ہوئی تھی لیکن پھر بھی سردی کی شدت بہت تھی۔ ہم لوگ یعنی میں، اکرم بٹ صاحب اور تاج الدین صاحب دھوپ میں کُرسیاں ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے۔ گپ شپ چل رہی تھی کہ اتنے میں قدرے معیاری بھرکم سے ایک صاحب تشریف لے آئے۔ اُن کے ہاتھ میں مونگ پھلی کا ایک لفافہ تھا جسے اُنہوں نے میز پر رکھا اور گفتگو شروع کر دی۔ اُن کی گفتگو میں کچھ ایسا جادو تھا کہ ہر شخص اُس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ہماری کرسیوں کے گرد کوئی چھ سات لوگ کھڑے اُن صاحب کی باتوں کا لُطف لے رہے تھے۔ اپنی گفتگو میں وہ اٹلی کا ذکر کرتے اور پھر اٹالین کا کوئی فقرہ بول کر اُس کا ترجمہ کرتے۔ جب وہ صاحب رُخصت ہوئے تو میں نے بٹ صاحب سے پوچھا کہ یہ کون صاحب تھے بڑی عمدہ گفتگو کر رہے تھے۔ بٹ صاحب نے کہا "ارے تم نہیں جانتے خان صاحب کو بھئی یہ اشفاق احمد خان تھے"۔ میں نے کہا بٹ صاحب "گڈریا" کہنے لگے "جی وہی وہی"۔

اُن دنوں اشفاق صاحب ہفت روزہ لیل و نہار کے ایڈیٹر تھے۔ پھر کچھ ہی عرصہ کے بعد اشفاق صاحب اسکرپٹ رائٹر کے طور پر ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک ہو گئے۔ اُن کی ڈیوٹی بھی ہمارے ہی سیکشن یعنی ری کسٹر کشن سیکشن میں لگ گئی۔ اب تو روز اُن سے ملاقات ہونے لگی۔ اُن دنوں وہ اسکرپٹ لکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف اداروں کے بارے میں ڈاکیو منٹری پروگرام بھی پروڈیوس کیا کرتے تھے۔ ڈاکیو منٹری پروگراموں کی ریکارڈنگ کے لیے میں اُن کے ہمراہ جایا کرتا تھا۔ ایک دن اشفاق صاحب کہنے لگے "یار کل ایک ریکارڈنگ کے لیے جانا ہے تم ایسا کرنا کہ مجھے صبح 10 بجے کے قریب فون کر کے یاد دلا دینا"۔ میں نے اگلے دن صبح 10 بجے فون کیا تو فون ایک خاتون نے اٹھایا۔ میں نے عرض کیا "جی اشفاق صاحب سے بات کرنا تھی"۔ بڑے خشک لہجے میں جواب آیا "جی خان تو اس وقت لائبریری میں ہیں"۔ میں نے عرض کیا "جی اُنہیں بتا دیں کہ اُن کو آج ریکارڈنگ کے لیے ریڈیو آنا ہے"۔ اُسی خشک لہجے میں جواب ملا "جی میں بتا دوں گی"، اور فون بند ہو گیا۔

اشفاق صاحب ریڈیو آگئے تو میں نے پوچھا کہ میرا پیغام مل گیا تھا۔ کہنے لگے ہاں ہاں مل گیا تھا۔ میں نے پوچھا جس خاتون سے میری بات ہوئی تھی وہ کون تھیں۔ اشفاق صاحب کہنے لگے بھئی تم نہیں جانتے وہ قدسیہ تھی۔ تم ایسا کرو اتوار کو ہمارے ہاں آجاؤ، دوپہر کا کھانا بھی اکٹھے کھائیں گے اور تمہاری قدسیہ سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ اتوار کو میں سمن آباد میں اشفاق صاحب کے ہاں پہنچا تو آپا قدسیہ سے ملاقات بھی ہو گئی۔ میں جس کو ایک عصبیلی اور خشک انداز میں بات کرنی والی سمجھتا تھا وہ تو انتہائی مہربان مزاج کی خاتون نکلیں، پھر اُن سے ایسا تعلق قائم ہوا جو اُن کے آخری وقت تک جاری رہا۔

اشفاق صاحب نے پروفیسر فہیم کے نام سے ایک فیچر لکھنا شروع کیا۔ پروفیسر فہیم کا کردار گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر چاولہ صاحب انجام دیا کرتے تھے۔ کوئی چھ سات مہینے کے بعد یہ فیچر ختم ہوا تو اشفاق صاحب نے "حسرت تعمیر" کے نام سے ایک دوسرا فیچر شروع کر دیا۔ اِس فیچر کی زبان پٹیالے کی تھی۔ بقول اشفاق صاحب یہ زبان اِس لیے رکھی کہ اسے اُردو دان طبقہ اور پنجابی بولنے والے دونوں آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ جب 1965ء کی پاک بھارت جنگ ہوئی تو اُس فیچر کا نام "تلقین شاہ" رکھ دیا گیا۔ یہ فیچر بہت مقبول ہوا اور غالباً ریڈیو پاکستان کی تاریخ کا سب سے لمبا فیچر تھا۔

جب اشفاق صاحب گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے اُردو کے طالب علم تھے اور بانو قدسیہ بھی اُسی سال ایم اے اُردو کر رہی تھیں۔ دونوں نے زندگی ساتھ بسر کرنے کا عہد کیا، لیکن اِس میں دقت یہ آگئی کہ اشفاق صاحب پٹھان تھے اور اُن کے والد ایک غیر پٹھان لڑکی کو اپنی بہو بنانے کو تیار نہ تھے۔

بہر حال یہ مشکل ختم ہوئی اور دونوں نے شادی کر لی۔ بانو قدسیہ صاحبہ نے اپنی خدمت گزاری سے اُس خاندان کو جو اُن کا سخت مخالف تھا ایسا گرویدہ کیا کہ خاندان کے ہر فیصلے میں اُن کی رائے ضرور شامل ہوتی۔

حنیف رامے صاحب، جو بعد میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ ہوئے، دھرم پورہ میں ایک بزرگ کے پاس جایا کرتے تھے۔ ایک روز وہ اشفاق صاحب کو دھرم پورہ میں اُن بزرگ کے پاس لے گئے۔ وہ بزرگ عام طور پر باباجی نور والے کے نام سے جانے جاتے تھے۔ اشفاق احمد ایک نہایت پڑھے لکھے انسان تھے۔ اُن پر مغرب کی تعلیم کا بھی بہت اثر تھا، لیکن جب وہ باباجی نور والے سے ملے تو اُن کا زاویۂ نگاہ بدل گیا۔ اُنہیں محسوس ہوا کہ اصل علم تو ہمارے بابوں کے پاس ہے، پھر اشفاق صاحب نے باقاعدگی کے ساتھ دھرم پورہ جانا شروع کر دیا۔ باباجی نور والے کا نام فضل شاہ تھا اور وہ جالندھر سے ہجرت کر کے لاہور آئے۔ باباجی اَن پڑھ تھے لیکن ایسی کمال کی بات کرتے تھے کہ اشفاق احمد جیسا دانشمند بھی اُن کی باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ باباجی نور والے نے اشفاق صاحب کی سوچ کے دھارے کو بدل دیا تھا، غلط نہ ہو گا۔

اشفاق صاحب کے والد فیروز پور میں جانوروں کے ڈاکٹر تھے اور تمام علاقے میں جہاں سکھوں کی اکثریت تھی بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ خاندان لاہور آگیا۔ اُس وقت ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آرہے تھے۔ لاہور میں اُن مہاجرین کو والٹن کیمپ میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ اشفاق صاحب نے رضاکارانہ طور پر اُس کیمپ میں اپنی خدمات پیش کیں۔ اُسی کیمپ میں ایک روز قائدِ اعظمؒ بھی تشریف لائے تو اشفاق احمد نے آگے بڑھ کر اُن سے ہاتھ ملایا۔ اُسی کیمپ میں اشفاق صاحب کی ملاقات ممتاز مفتی صاحب سے ہوئی جو تمام زندگی قائم رہی۔

ایک بار مفتی جی بیمار ہو گئے، مقامی طور پر علاج ہوا لیکن طبیعت بہتر نہ ہوئی۔ بانو قدسیہ صاحبہ نے مفتی جی سے کہا کہ "آپ چند روز کے لیے اسلام آباد سے لاہور ہمارے ہاں لاہور آجائیں، میں دوائیوں سے نہیں غذا سے آپ کا علاج کروں گی"۔ چنانچہ مفتی جی ماڈل ٹاؤن لاہور آگئے۔ بانو قدسیہ صاحبہ نے اُن کے کھانے کا چارٹ بنایا اور دس دن کے بعد مفتی صاحب کی طبیعت بحال ہو گئی۔

قدرت اللہ شہاب سے بھی اشفاق صاحب کا گہرا تعلق تھا۔ شہاب صاحب لاہور آتے تو اشفاق صاحب کے ہاں ہی قیام کرتے اور اشفاق صاحب اسلام آباد آتے تو وہ شہاب صاحب کے ہاں ہی ٹھہرتے۔ ایک روز میں اشفاق صاحب کے ہاں شام کے قریب گیا اور حسبِ عادت میں نے گفتگو شروع کر دی لیکن کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ اشفاق صاحب میری باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے، پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

میں نے سوچا کہ شاید مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے جس کے باعث اشفاق صاحب کچھ خفا ہو گئے ہیں۔ میں نے کافی اِدھر اُدھر کی باتیں کیں لیکن اشفاق صاحب گفتگو کے موڈ میں ہی نہیں تھے۔ آخر میں نے اجازت چاہی اور گھر چلا آیا لیکن اِس خیال سے پریشان رہا کہ آج اُن کا رویہ اِس قدر خشک کیوں تھا۔ اگلی صبح جب اخبار دیکھا تو اُس میں شہاب صاحب کے انتقال کی خبر تھی۔ میں سمجھ گیا کہ خاموشی کی وجہ کیا تھی۔ یقینی طور پر اُن کو علم تھا کہ شہاب انتقال کر چکے ہیں۔ دو دن کے بعد جب وہ اسلام آباد سے واپس آئے تو میں نے پوچھا خان صاحب اُس روز جب میں آیا تھا تو کیا آپ کو علم تھا کہ شہاب صاحب اب اِس دنیا میں نہیں رہے۔ اشفاق صاحب کہنے لگے کہ ہم تو سلام آباد جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے کہ تم آگئے۔ میں نے عرض کیا جب آپ کو علم تھا تو مجھے کیوں نہ بتایا۔ کہنے لگے میں نے سوچا کہ تمہاری رات کیوں خراب کروں صبح تمہیں علم ہو ہی جائے گا۔

ایک دن دفتر میں بیٹھا تھا کہ اشفاق صاحب کا فون آگیا کہ کیا کر رہے ہو۔ میں نے عرض کیا کوئی خاص تو نہیں بس روٹین کا کام کر رہا ہوں۔ کہنے لگے کہ آجاؤ تمہیں ایک صاحب سے ملوانا ہے۔ میں اسکوٹر پر بیٹھا اور اُن کے دفتر پہنچ گیا۔ اشفاق صاحب اُن دنوں مرکزی اُردو بورڈ کے ڈائریکٹر تھے۔ اُن کے کمرے میں ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیانہ قد، گندمی رنگ، گھُنگھریالی بال۔ اشفاق صاحب نے تعارف کروایا یہ واصف علی واصف صاحب ہیں۔ اور پھر میری طرف اشارہ کر کے کہا یہ ریاض محمود ہیں۔ واصف صاحب نے کہا کوئی سوال پوچھیں، میں نے ایسے ہی جو ذہن میں آیا پوچھ لیا لیکن جواب ایسا مدلل آیا کہ میں واصف صاحب کی علمیت کا قائل ہو گیا۔ یہ کوئی آدھ گھنٹے کی نشست تھی جس میں واصف صاحب کی باتوں نے ہمیں پوری گرفت میں لے لیا۔ اِس ملاقات کے بعد اشفاق صاحب نے اپنے گھر میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے سرکردہ افراد کو مدعو کرنا شروع کیا اور اُن کی ملاقاتیں واصف صاحب سے کروائیں۔ یوں واصف صاحب تمام اہلِ علم حضرات سے متعارف ہو گئے۔

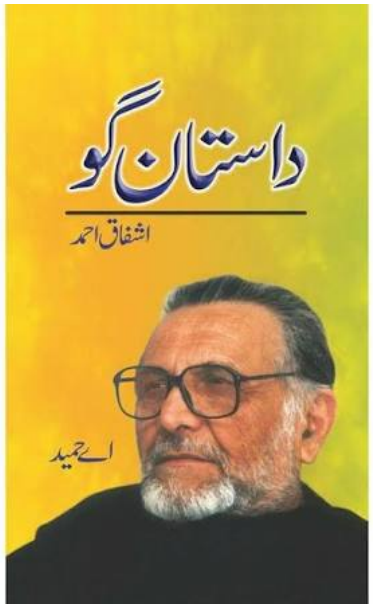
1964ء میں جب ٹیلی ویژن پاکستان میں آیا تو اشفاق صاحب نے ٹیلی ویژن کے لیے بہت لکھا اور پھر بعد کے لکھنے والوں نے بھی اُنہی خطوط پر لکھنا شروع کیا جو راستہ اشفاق صاحب نے اختیار کیا تھا۔ اُن کے ڈرامے "حیرت کدہ، منچلے کا سودا اور پھر ٹاہلی تھلے اور اُچے برج لاہور دے" ایسے ڈرامے تھے جنہوں نے پوری دنیا میں پی ٹی وی کو شناخت دی۔

اشفاق صاحب نے "دھوپ اور سائے" کے نام سے ایک فلم بھی بنائی۔ کہانی اور کاسٹ کے اعتبار سے یہ اچھی فلم تھی لیکن ٹیکنکل معاملات میں اشفاق صاحب نے کچھ تجربات کیے جو کامیابی حاصل نہ کر سکے اور فلم باکس آفس پر ناکام ہو گئی۔

اشفاق صاحب بیمار ہو گئے تو میں ہر روز عیادت کے لیے جاتا۔ ایک روز کچھ ذاتی مصروفیات کے باعث نہ جا سکا تو اگلے روز اُنہوں نے ناراضی کا اظہار کیا۔ چنانچہ اُس دن کے بعد سے اُن کے آخری دن تک میں نے پھر کبھی غیر حاضری نہ کی۔ ایک دن ہسپتال میں کہنے لگے یار دنیاوی کاموں میں پڑے رہے، زیادہ گھومے پھرے نہیں، میں ذرا صحت مند ہو جاؤں تو پھر بہت سی جگہوں پر جانا ہے اور تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ میں نے عرض کیا خان صاحب آپ جلد صحت مند ہو جائیں جہاں آپ کا حکم ہو گا میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ خان صاحب اسپتال سے گھر آگئے۔ ایک دن کہنے لگے کہ "دن تو گزر جاتا ہے لیکن رات بہت لمبی ہو جاتی ہے۔ میں رات بھر جاگتا ہوں کھڑکی میں سے باہر دیکھتا رہتا ہوں کہ کب صبح کی روشنی نمودار ہو گی اور رات کی سیاہی ختم ہو گی"۔

وہ سات ستمبر 2004ء کی صبح تھی جب اشفاق صاحب اِس دنیا کو چھوڑ کر اُس سفر پر روانہ ہو گئے جس پر جانے والا کبھی واپس نہیں آتا۔ اشفاق صاحب اِس دنیا سے ناطہ توڑ گئے لیکن اُن کے ڈرامے، افسانے، پروگرام زاویہ اور دوسری ادبی تحریریں ہمیشہ اُن کا نام زندہ رکھیں گی۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اُنہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔



بشکریہ ریڈیو پاکستان لاہور

انشائیہ

موسم بالکل صاف تھا

تحریر: شاہد اللہ خان

چائے کے ہوٹل میں بیٹھ کر آدمی دنیا کے بہت سے مسئلے حل کر سکتا ہے، بشرطیکہ مسئلہ حل کرنے کی اُسے کوئی خاص جلدی نہ ہو۔ ہمارے ہاں چائے کا ہوٹل صرف چائے پینے کی جگہ نہیں۔ یہاں چائے کے ساتھ رائے بھی ملتی ہے، اور ایسی پکی کہ آدمی کو کتاب، اخبار اور دلائل، تینوں سے بے نیاز کر دے۔ یہاں سیاست سے لے کر شاعری تک ہر موضوع پر گفتگو ہو سکتی ہے۔

چائے والا اگر دو کپ غلط میز پر رکھ دے تو بات پہلے اتنی سی ہوتی ہے کہ چائے کس کی ہے۔ پھر کسی کو چائے کی قیمت یاد آتی ہے، کسی کو دودھ کی ملاوٹ، اور کسی کو پرانے زمانے کی چائے۔ یوں گفتگو آہستہ آہستہ میز سے اُٹھ کر پورے شہر میں پھیل جاتی ہے۔

بنوں کے چائے کے ہوٹلوں کی اپنی ایک دنیا ہے۔ یہاں آدمی اکیلا بیٹھا ہو تو بھی زیادہ دیر اکیلا نہیں رہتا۔ کسی نہ کسی میز سے کوئی بات اُٹھتی ہے، دوسری میز تک پہنچتی ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پوری مجلس اِس میں شریک ہو جاتی ہے۔

ایک روز میں بھی ایسے ہی ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ چائے ابھی آئی نہیں تھی اور سامنے والی میز پر دو صاحب شاعری کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ابتداء میں میں نے خاص توجہ نہیں دی، مگر پھر ایک جملہ میرے کان میں پڑا:

"سنا ہے، سیلاب بھی آ رہا ہے۔"

میں نے سر اٹھایا۔

موسم بالکل صاف تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان پر بادل کا نام و نشان نہیں تھا۔ بنوں کی وہ معمول کی دوپہر تھی جس میں دھوپ بھی ایسے پھیلی ہوتی ہے جیسے اُسے معلوم ہو کہ اُس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

میں نے سوچا، شاید بارش کی کوئی خبر ہو۔

دوسرے صاحب نے چائے کا گھونٹ لیا اور کہا: "اور طوفان کے آنے کا بھی امکان ہے۔"

اب میری توجہ پوری طرح اُن کی طرف ہو گئی۔

پہلے صاحب نے کہا: ہاں، طوفان کا بھی پروگرام ہے۔"

یہ "پروگرام" کا لفظ کچھ عجیب تھا۔ سیلاب اور طوفان کے پروگرام عام طور پر اِس طرح نہیں بنتے۔

میں نے چائے کا انتظار چھوڑ کر اُن دونوں کی گفتگو سننا شروع کر دی۔

"دریاب (دریا) بھی آ رہا ہے؟"

"بالکل۔ اُن کا آنا بھی طے ہے۔"

اب معاملہ میری سمجھ سے باہر ہو چکا تھا۔

ایک ہی جگہ سیلاب، طوفان اور دریاب (دریا) کے آنے کی خبر دی جا رہی تھی اور چائے والا اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ سامنے ایک صاحب اخبار پڑھ رہے تھے اور دوسرے نہایت اطمینان سے چائے پی رہے تھے۔ مجھے صرف یہ بات کھٹک رہی تھی کہ سیلاب اور طوفان کی اتنی بڑی خبر پر یہاں کسی کو کوئی فکر نہیں تھی۔

میں نے سوچا، شاید مجھے ہی کچھ معلوم نہیں۔

آخر ہمت کر کے پوچھ لیا:

"معاف کیجیے گا، یہ سیلاب کہاں سے آ رہا ہے؟"

دونوں نے میری طرف دیکھا۔

ایک نے کہا: "یہیں، بنوں سے۔"

میں نے بے اختیار کھڑکی سے باہر دیکھا۔

بنوں وہیں تھا۔

میں نے دوبارہ پوچھا: "بنوں سے؟"

"جی۔"

"اور طوفان؟"

"وہ بھی بنوں سے۔"

اب مجھے پہلی مرتبہ اپنے علم پر شک ہوا۔ سیلاب کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا، طوفان بھی دیکھے تھے، دریاؤں کا ذکر بھی کئی بار آیا تھا، لیکن ایک ہی دن میں تینوں کو ایک ہی شہر سے ہوئے پہلی مرتبہ سُن رہا تھا۔

میں نے چائے والے کو دیکھا۔ وہ مطمئن تھا۔

میں نے اخبار والے کو دیکھا۔ وہ بھی مطمئن تھا۔

مجھے لگا، شاید بنوں کے لوگوں کو کسی نئی قسم کی موسمی صورتِ حال کی عادت ہو گئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد پہلے صاحب نے کہا:

"جمعرات کا مشاعرہ اچھا رہے گا۔"

تب جا کر میری جان میں جان آئی۔

سیلاب، طوفان اور دریاب (دریا)، سب شاعر تھے۔

میں نے چائے کا کپ اٹھایا۔ باہر موسم صاف تھا، مگر میرے ذہن میں تخلصوں نے ایک عجیب سا موسم پیدا کر دیا تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ایک لفظ، اگر کسی شاعر کے نام کے ساتھ لگ جائے، تو اُس کے معنی صرف لغت میں نہیں رہتے۔ وہ آدمی کے ساتھ چلنے لگتے ہیں۔

شاید اِسی کو تخلص کی اصل طاقت کہنا چاہیے۔

شاعر کا اصل نام خواہ کتنا ہی سادہ ہو، تخلص آتے ہی آدمی کے گرد ایک نئی فضا بن جاتی ہے۔ "گل" ہو تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ شاعر ہے، گل کھلا رہا ہے، مناسب بات ہے۔

"ساحل" ہو تو بھی کوئی پریشانی نہیں۔ "چمن" ہو تو بھی آدمی کو کسی خطرے کا احساس نہیں ہوتا۔

لیکن "سیلاب" ہو تو آدمی شعر سننے سے پہلے اپنے گھر کا نقشہ ذہن میں دیکھنے لگتا ہے کہ گھر کا فرش گلی کی سطح سے اونچا ہے یا نہیں۔

اور اگر تخلص "طوفان" ہو تو آدمی شاعر کے مزاج سے پہلے کھڑکیوں کی مضبوطی پر غور کرے گا۔

"دریاب (دریا)" میں البتہ ایک شاعرانہ وسعت ہے۔ لفظ سنتے ہی پانی، روانی اور گہرائی کا خیال آتا ہے۔ مگر اگر کوئی آپ سے کہے:

"آج دریاب (دریا) بھی آ رہا ہے۔"

اور آپ کو معلوم نہ ہو کہ بات شاعر کی ہو رہی ہے تو ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہو گا کہ آخر پانی کس راستے سے آنے والا ہے۔

یہی تخلص کی دلچسپ بات ہے۔ شاعر کو ایک دوسرا نام مل جاتا ہے، مگر کبھی کبھی وہ دوسرا نام شاعر سے آگے نکل جاتا ہے۔

پہلا نام ماں باپ رکھتے ہیں، دوسرا شاعر خود رکھتا ہے۔ پہلے نام میں والدین کی مرضی ہوتی ہے، دوسرے میں شاعر کی۔ شاید اِسی لیے پہلے نام میں آدمی کی شناخت ہوتی ہے اور دوسرے میں اُس کی خواہش۔

شاعر اپنے لیے ایسا لفظ چنتا ہے جس میں اُسے اپنی کوئی صورت دکھائی دیتی ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ حقیقت میں ویسا ہی ہو۔ شاید اِسی لیے تخلص کبھی کبھی شاعر کی شخصیت سے زیادہ اُس کی خواہش کا پتہ دیتا ہے۔

جو شخص بہت کم بولتا ہے، "طوفان" کہلا سکتا ہے۔

جو خاموش طبیعت رکھتا ہے، "برق" ہو سکتا ہے۔

جو ساری عمر پانی سے دور رہا ہو، "سمندر" بن سکتا ہے۔

اور جو چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے بھی اِس بات کا خیال رکھے کہ چھینٹا نہ پڑے، وہ "سیلاب" کہلا سکتا ہے۔

اِس میں شاعر کا کوئی قصور نہیں۔ شاعری میں آدمی کو اتنی آزادی تو ملنی چاہیے کہ وہ اپنے لیے ایسا نام منتخب کر سکے جو اُس کے دل کو پسند ہو، خواہ اُس نام سے دنیا کو چند لمحوں کے لیے خطرہ ہی کیوں نہ محسوس ہو۔

شاید تخلص شاعر کا دعویٰ نہیں، اپنے آپ سے ایک چھوٹی سی گفتگو ہے۔

وہ اپنے نام کے ساتھ ایک ایسا لفظ لگا دیتا ہے جس سے اُسے کوئی نسبت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی اِس لفظ میں اُس کی طبیعت کا عکس ہوتا ہے، کبھی کوئی خواہش، کبھی کوئی خواب، اور کبھی صرف ایک خوب صورت لفظ کی کشش۔

اِسی لیے ایک ہی لفظ دو مختلف شاعروں کے ساتھ دو مختلف معنی اختیار کر لیتا ہے۔

"گل" صرف پھول نہیں رہتا۔

"ساحل" صرف کنارے کا نام نہیں رہتا۔

"سمندر" صرف پانی کا ایک وسیع پھیلاؤ نہیں رہتا۔

اور "سیلاب" صرف پانی کا بہاؤ نہیں رہتا۔

وہ ایک آدمی بن جاتا ہے، شعر پڑھتا ہے، داد لیتا ہے، چائے پیتا ہے اور پھر گھر چلا جاتا ہے۔

البتہ تخلص کا کیا کیا جائے؟

وہ کبھی کبھی شاعر سے زیادہ دُور تک سفر کرتا ہے۔

ہمارے ہاں مشاعرے کا اعلان بھی تخلص کی وجہ سے کبھی کبھی خاصا پُراثر ہو جاتا ہے۔

ذرا تصور کیجیے، ناظمِ مشاعرہ مائیک پر آ کر کہے:

"خواتین و حضرات، اب تشریف لا رہے ہیں جناب طوفان صاحب!"

تالیاں بجیں۔ طوفان صاحب اُٹھیں۔

نہایت سکون سے مائیک تک پہنچیں۔

کاغذ کھولیں، گلا صاف کریں اور اتنی دھیمی آواز میں کہیں:

"عرض کیا ہے..."

سامنے بیٹھا ہوا کوئی شخص شاید دل ہی دل میں سوچے کہ یہ کیسا طوفان ہے جو آنے سے پہلے بھی اتنا خاموش تھا اور آنے کے بعد بھی۔

پھر طوفان صاحب ایسی غزل پڑھ دیں جس میں نہ آندھی ہو، نہ بادل، نہ بجلی۔ صرف محبوب کی بے وفائی ہو اور شاعر کا دل۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ بعض شاعروں کے تخلص اُن کی شخصیت سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں۔

سیلاب صاحب نہایت محتاط آدمی ہو سکتے ہیں۔

طوفان صاحب کسی سے بحث نہ کرتے ہوں گے۔

سمندر صاحب شاید ایک کپ چائے سے زیادہ نہ پی سکتے ہوں۔

اور برق صاحب کو اگر کسی محفل میں بلایا جائے تو ممکن ہے وقت پر پہنچنے میں بھی کچھ وقت لگے۔

تخلص میں شاعر اپنی ایک الگ دنیا آباد کرتا ہے۔

کسی کا "گل" ہے تو وہ پھولوں کے قریب رہتا ہے۔

کسی کا "ساحل" ہے تو وہ کنارے پر کھڑا ہے۔

کسی کا "سمندر" ہے تو وہ گہرائی کے خیال کے ساتھ جیتا ہے۔

اور کسی کا "دریاب (دریا)" ہے تو اُس کے نام میں بہنے کی ایک پوری کیفیت شامل ہو جاتی ہے۔

حالاں کہ حقیقت میں سب اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے چائے پی رہے ہوتے ہیں۔

مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر شاعر اپنے تخلص کے معنی کے مطابق زندگی گزارنے لگیں تو خاصی مشکل پیدا ہو جائے۔

سیلاب صاحب جہاں جائیں، لوگ سامان اونچا رکھنے لگیں۔

طوفان صاحب آئیں تو دروازے اچھی طرح بند کیے جائیں۔

سمندر صاحب سے ملنے کے لیے شاید ساحل تلاش کرنا پڑے۔

اور دریاب (دریا) صاحب سے ملاقات کے لیے آدمی پہلے یہ معلوم کرے کہ وہاں پہنچنے کے لیے پُل کس طرف ہے۔ خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوتا۔

شاعر "سیلاب" ہو کر بھی خشک زمین پر چل سکتا ہے، "سمندر" ہو کر بھی ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ سکتا ہے اور "برق" ہو کر بھی گھنٹوں خاموش رہ سکتا ہے۔

شاید یہی شاعری کی آزادی ہے۔ آدمی اپنے نام کے ساتھ ایک ایسی دنیا رکھ سکتا ہے جس میں وہ حقیقت میں نہیں رہتا۔

اِس واقعے کے بعد میں نے سوچا کہ اگر کبھی مجھے بھی تخلص رکھنے کی ضرورت پڑی تو ذرا سوچ سمجھ کر رکھوں گا۔

سب سے پہلے "دریاب (دریا)" ذہن میں آیا۔

اچھا نام ہے۔

پھر خیال آیا کہ مجھے تیرنا نہیں آتا۔

"سمندر" بھی خوب ہے۔

لیکن سمندر کے نام کے ساتھ لوگ گہرائی کی توقع کرتے ہیں، اور آدمی ہر وقت گہرا نہیں ہو سکتا۔

"طوفان" بھی خوب ہے۔ مگر آدمی خود کتنا ہی پُرسکون کیوں نہ ہو، ہر جگہ اپنے نام کی صفائی تو نہیں دیتا پھر سکتا۔

"سیلاب" پر بھی دل آیا، لیکن کسی کو فون پر یہ کہنا کہ "میں سیلاب بول رہا ہوں"، کچھ زیادہ ہی ذمہ داری والا تعارف معلوم ہوا۔

سو میں نے تخلص رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اپنا اصل نام ہی بہتر ہے۔

کم از کم اگر کوئی کہے کہ "فلاں صاحب آ رہے ہیں" تو گھر والے کھڑکیاں بند کرنے نہیں لگیں گے۔

ویسے بھی، آخر میں بات تخلص پر نہیں آتی، شعر پر آتی ہے۔

تخلص "سمندر" ہو اور شعر میں گہرائی نہ ہو تو سمندر صرف نام رہ جاتا ہے۔

تخلص "سیلاب" ہو اور شعر دل تک نہ پہنچے تو پانی بھی بے اثر ہے۔

اور تخلص "طوفان" ہو، مگر شعر میں کوئی ہلچل نہ ہو تو آدمی خاموشی سے چائے کا دوسرا کپ مانگ لیتا ہے۔

ہاں، مشاعرے کے منتظمین سے ایک گزارش ضرور ہے۔

اگر ایک ہی شام کو سیلاب، طوفان، سمندر اور دریاب (دریا) سب تشریف لا رہے ہوں تو اعلان ذرا واضح کیا کریں۔

آخر میں صرف اتنا کہہ دیا کریں:

"خواتین و حضرات، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب شاعر ہیں۔"

ورنہ ہم جیسے لوگ مشاعرہ سُننے سے پہلے اپنے گھر کا فرش دیکھنے لگتے ہیں کہ گلی کی سطح سے اونچا ہے یا نہیں۔

بشکریہ پی بی سی بنوں

ریڈیو کالم

خواب

تحریر: افضل خان

اگر ہم جدید تحقیق پر کچھ مغزماری کر بھی لیں، تو گھوم پھر کر اِسی پرانے اور گھسے پٹے فلسفے کی طرف لوٹ آئیں گے کہ انسان دن بھر جو کچھ سوچتا اور خیال کرتا ہے، رات کو وہ سب کچھ یا اُس کا کچھ حصہ خواب کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ لیکن صاحبو! آخر یہ خواب ہے کیا چیز؟ اور بند آنکھوں سے کیسے دکھائی دیتا ہے؟ عجیب بات ہے کہ اِدھر آنکھ کھلی اور اُدھر منظر غائب، عجیب مخمصہ ہے۔

بعض اوقات تو بے حد اُلٹ پُلٹ خوابوں سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ مثلاً ابھی آپ نے دیکھا کہ آپ گھر میں ہیں، دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو چڑیا گھر میں پائیں گے، ابھی آپ ہنس رہے تھے، لیکن دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو روتا ہوا پائیں گے۔ اِن بے سر و پا خوابوں نے ہمیں ایک عمر تک پریشان کیے رکھا۔ پھر کسی نے بتایا کہ ایسے خواب فارغ الذہن اور غبی قسم کے لوگوں کو آیا کرتے ہیں۔ لیجیے صاحب! وہ دن اور آج کا دن، ہم نے ایسے خواب ہی دیکھنا چھوڑ دیئے اور اگر کبھی اِس طرح کا خواب آ بھی جائے تو کسی سے تذکرہ نہیں کرتے، اور یہی بات ہماری عقلمندی کی روشن دلیل ہے۔

اُردو ادب میں لفظ 'خواب' کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے طرح طرح سے اِس لفظ کو اُجاگر کیا ہے، مثلاً خواب دیکھنا، خواب دکھانا، خواب ٹوٹنا، خواب کی تعبیر ملنا، خواب کا دروازہ کھلنا، خوابِ خرگوش کے مزے لینا اور پتا نہیں کیا کیا! لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اِن تمام باتوں کا مفہوم ایک ہی ہے، خواب خواب ہی ہوتا ہے اور لازم نہیں کہ اِس کا حقیقت سے بھی کوئی تعلق ہو۔

ہمارے ایک دوست کو دو خواب نہایت تواتر کے ساتھ آیا کرتے تھے۔ پہلا یہ کہ اُن کی شادی انتہائی حسین و جمیل خاتون سے ہو رہی ہے اور دوسرا یہ کہ اُن کے پاس دولت کے انبار لگ گئے ہیں۔ اُن کے بقول اوّل الذکر خواب کی تعبیر نہایت اُلٹی نکلی ہے جبکہ ثانی الذکر خواب کی تعبیر کی تگ و دو میں موصوف سارا سارا دن اپنی بائی سائیکل پر ہا کری کرتے ہیں۔

شاید آپ ہماری اِس بات سے اتفاق نہ کریں، لیکن ہم آپ کو یقین دلانے کی بھرپور کوشش کریں گے کہ بعض اوقات بہت سے لوگ مل کر بھی ایک خواب دیکھ سکتے ہیں۔ بات بہت عجیب ہے، لیکن اگر آپ غور کریں تو ایسا بالکل ممکن ہے۔ ہمارے یونیورسٹی کے زمانے میں ہمارے ساتھ ایک بی بی بھی پڑھا کرتی تھیں، جو کہ کالج کی تمام دوسری لڑکیوں سے شکل و صورت میں نمایاں تھیں۔ لہٰذا ہم سب لڑکے مل کر موصوفہ کے خواب دیکھتے تھے۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہمیں اُس خواب کی تعبیر نہ مل سکی، لیکن باعثِ مسرت پہلو یہ ہے کہ دوسرے لوگ بھی صرف خواب تک ہی محدود رہے۔

کہتے ہیں کہ جو خواب صبح کے وقت دیکھا جائے وہ سچا ہوتا ہے۔ ہم اِس بات کو نہیں مانتے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے صبح کے وقت خواب دیکھا کہ ہم بی اے کے امتحان میں فیل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ کچھ دن بعد رزلٹ آنے پر ہمارے پاس اِس فلسفے کو ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

کہتے ہیں کہ خوابوں کی تعبیر بتانا ہر آدمی کا کام نہیں۔ ہمارے ایک دوست نے کسی بزرگ کو اپنا خواب سنایا اور تعبیر پوچھی۔ بزرگ نے بتایا کہ تم بڑے ہو کر ڈاکٹر بنو گے۔ موصوف پر ڈاکٹر بننے کا ایسا خبط سوار ہوا کہ اِسی دُھن میں مریض بن کر رہ گئے۔

ایک بار ہم نے خواب دیکھا کہ ہماری ٹیم ورلڈ کپ جیت گئی ہے۔ ہم نے اِس خواب کا تذکرہ اپنے احباب سے کیا تو سب نے اُسے دیوانے کا خواب قرار دیا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ہماری قومی ٹیم نے بھی ہمارے دوستوں کے اِس بیان کو غلط ثابت نہ ہونے دیا۔

کچھ خوابوں کا سلسلہ نسل در نسل چلتا ہے۔ کچھ عظیم لوگ خواب دیکھتے ہیں، جن کی تعبیر بھی اِنہی جیسی شخصیات حاصل کرتی ہیں۔ اِس ضمن میں فرض شناسی کا بھی بہت دخل ہے۔

مثلاً علامہ اقبالؒ نے ایک خواب دیکھنا تھا، دیکھا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اُس کو تعبیر کرنا تھا، کیا۔

عمر کے اِس حصے میں آ کر ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خواب دیکھنا اچھی بات ہے لیکن کبھی حقیقت سے مُنہ موڑنا اور خوابوں کی دنیا میں جا بسنا اچھی بات نہیں ہے۔ اچھا خواب انسان کے لیے ایک اُمید کی طرح ہوتا ہے اور اُمید ہی سے دنیا قائم ہے۔ انسان مسلسل محنت اور بلند عزم کی بدولت وہ کچھ حاصل کر سکتا ہے جس کا تصور بھی بعض اوقات اُس کے لیے محال ہوتا ہے۔

بشکریہ پی بی سی بہاولپور

سنگِ سیاہ: بلوچستان کی تاریخ، روایت اور ثقافت

تحریر:۔ ڈاکٹر عابد میر

سنگِ سیاہ ضلع کیچ کی تحصیل تلار کے قریب واقع ایک پہاڑی علاقہ ہے۔ تلار، تربت اور گوادر کو ملانے والے زمینی راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے قدیم زمانے سے اہمیت رکھتا آیا ہے۔ یہ علاقہ مکران کے اُن اندرونی راستوں میں شامل ہے جن کے ذریعے لوگ ساحلی بستیوں، وادیوں کیچ، پنجگور اور ایران کے سرحدی علاقوں کے درمیان سفر کرتے رہے ہیں۔

سنگِ سیاہ کے اطراف خشک پہاڑ، موسمی ندی نالے، پتھریلی زمین اور قدرتی درے پائے جاتے ہیں۔ یہی جغرافیہ صدیوں تک یہاں کے باشندوں کی معاشرت، نقل و حرکت اور طرزِ زندگی کو تشکیل دیتا رہا۔ اگرچہ یہ علاقہ بظاہر خاموش اور ویران دکھائی دیتا ہے، لیکن مکران کی تاریخ میں ایسی ہی پہاڑیاں انسانی سرگرمیوں، چراگاہوں اور سفری راستوں کا حصہ رہی ہیں۔

"سنگِ سیاہ" فارسی الاصل مرکب ہے جس کے معنی ہیں "سیاہ پتھر" یا "کالی چٹان"۔ غالب امکان یہی ہے کہ اِس مقام کا نام وہاں موجود گہرے رنگ کی چٹانوں کی وجہ سے پڑا ہو۔ مکران کی ارضیاتی ساخت میں آتش فشانی اور تلچھٹی چٹانیں بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں، جن میں بعض مقامات پر سیاہی مائل رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ اگرچہ اِس نام کے بارے میں کوئی مستند تاریخی روایت دستیاب نہیں، لیکن مکران میں مقامات کے نام اکثر اُن کی طبعی خصوصیات کی بنیاد پر رکھے گئے ہیں، اِس لیے یہ توجیہہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔

جغرافیائی اہمیت

مکران کو سمجھنے کے لیے اِس کے پہاڑوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہاں کی بستیاں ہمیشہ پانی، دَروں اور قدرتی گزرگاہوں کے ساتھ آباد ہوئیں۔ سنگِ سیاہ بھی اِسی سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہوتا ہے۔ یہ پہاڑی نہ صرف قدرتی منظر نامے کا حصہ ہے بلکہ ممکنہ طور پر ماضی میں مقامی لوگوں اور قافلوں کے لیے ایک نشانِ راہ بھی رہی ہوگی۔

تلار کا پورا خطہ ارضیاتی اعتبار سے بھی اہم ہے۔ ماہرینِ ارضیات نے اِس علاقے کی چٹانوں اور زمینی ساخت پر تحقیق کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکران کا یہ حصہ لاکھوں برس کے ارضیاتی عمل کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ سنگِ سیاہ پر الگ سے کوئی جامع تحقیق موجود نہیں، لیکن اِس کی زمینی ساخت اِسی وسیع ارضیاتی نظام کا حصہ ہے جس نے مکران کے پہاڑوں، وادیوں اور ساحلی پٹی کو تشکیل دیا۔

یہی وجہ ہے کہ سنگِ سیاہ کی اہمیت صرف ایک مقامی پہاڑی کی نہیں بلکہ مکران کے قدرتی اور تاریخی منظر نامے کے ایک ایسے جزو کی ہے، جسے ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ آنے والے حصوں میں ہم دیکھیں گے کہ قدیم مکران کی تاریخ، تجارتی راستوں اور علاقائی تہذیبوں کے تناظر میں اِس مقام کی حیثیت کو کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

تاریخی و تہذیبی پس منظر

سنگِ سیاہ کی تاریخی حیثیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اِسے صرف ایک الگ پہاڑی کے طور پر نہ دیکھا جائے بلکہ مکران کی مجموعی تاریخ اور کیچ کی تہذیبی روایت کے تناظر میں پرکھا جائے۔ چونکہ اِس مقام کے بارے میں براہِ راست تاریخی تحریری مواد نہایت محدود ہے، اِس لیے اِس کا پسِ منظر مکران کی عمومی تاریخ، قدیم جغرافیہ اور دستیاب تاریخی ماخذ کی روشنی میں واضح کیا جا سکتا ہے۔

قدیم زمانے میں مکران جنوبی ایشیا، ایران اور عرب دنیا کے درمیان ایک قدرتی پُل کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ خطہ بحیرۂ عرب کے ساحل کے ساتھ ساتھ مشرق میں سندھ اور مغرب میں موجودہ ایرانی بلوچستان تک پھیلا ہوا تھا۔ عرب، فارسی اور یونانی مؤرخین نے مختلف ادوار میں مکران کا ذکر ایک ایسے خطے کے طور پر کیا ہے جہاں دشوار گزار پہاڑ، کم آبادی، موسمی ندی نالے اور طویل فاصلے پر واقع بستیاں موجود تھیں۔



اِس کے باوجود مکران کبھی دنیا سے کٹا ہوا علاقہ نہیں رہا بلکہ قدیم تجارتی قافلوں اور عسکری مہمات کی گزرگاہ رہا۔

قدیم یونانی مؤرخین کے مطابق سکندرِ اعظم کی واپسی کے دوران اُس کی فوج نے جس دشوار گزار علاقے سے گزر کر سندھ سے ایران کی طرف سفر کیا، وہ گدروسیا (Gedrosia) کہلاتا تھا، جسے بعد کے ادوار میں مکران سے منسلک کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ سکندر کا لشکر تلار یا سنگِ سیاہ کے قریب سے گزرا تھا، تاہم اِس میں شبہ نہیں کہ اِس پورے خطے کے پہاڑی راستے قدیم زمانے سے انسانی آمد و رفت کا حصہ رہے ہیں۔

اسلامی دور میں مکران کی اہمیت مزید بڑھ گئی۔ آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم کی سندھ کی مہم کے دوران مکران ایک اہم عبوری خطہ تھا۔ اُس کے بعد عرب جغرافیہ دانوں اور مؤرخین، مثلاً ابنِ خرداذبہ، اصطخری، مقدسی اور حدود العالم کے مصنف نے مکران کا ذکر کیا ہے۔ اُن کے مطابق کیچ اِس علاقے کا ایک نمایاں شہری مرکز تھا، جہاں سے اِرد گرد کی وادیوں اور پہاڑی علاقوں کا انتظام کیا جاتا تھا۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ ضلع کیچ کا بیش تر حصہ، جس میں تلار کا علاقہ بھی شامل ہے، اُس وقت بھی علاقائی جغرافیے کا اہم جزو تھا۔

برطانوی دور میں مکران کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے باعث اِس کے بارے میں متعدد گزیٹیرز اور سروے تیار کیے گئے۔ اِن دستاویزات میں کیچ، تربت، پنجگور، گوادر اور مکران کے پہاڑی سلسلوں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ مکران کی اندرونی وادیاں اور پہاڑی درے مقامی قبائل، تجارت اور انتظامی روابط کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے تھے۔ اگرچہ دستیاب گزیٹیرز میں سنگِ سیاہ کا نام واضح طور پر درج نہیں ملتا، لیکن تلار اور اِس کے گرد و نواح کو مکران کے اہم جغرافیائی خطے کے طور پر ضرور بیان کیا گیا ہے۔

تاریخی پسِ منظر کو سمجھنے میں آثارِ قدیمہ بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کیچ کی وادی اور اِس کے آس پاس کے علاقوں میں متعدد قبل از تاریخ اور قدیم آثار دریافت ہو چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ ہزاروں برس سے انسانی آبادی کا مرکز رہا ہے۔ شاہی تمپ، سوراب اور دیگر قدیم مقامات اِس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ وادیٔ کیچ میں منظم انسانی آبادیاں موجود تھیں۔ اگرچہ سنگِ سیاہ پر ابھی تک باقاعدہ آثارِ قدیمہ کی کھدائی نہیں ہوئی، لیکن اِس کے جغرافیائی محلِ وقوع کو دیکھتے ہوئے یہ امکان موجود ہے کہ مستقبل کی تحقیق اِس علاقے کے بارے میں نئے شواہد سامنے لائے۔

یہ تمام تاریخی شواہد اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ سنگِ سیاہ کو محض ایک خاموش پہاڑی سمجھنا درست نہیں۔ یہ مکران کے اُسی وسیع تاریخی اور تہذیبی منظر نامے کا حصہ ہے جس نے صدیوں تک قافلوں کی آمد و رفت، مقامی آبادی کی زندگی، علاقائی سیاست اور تہذیبی ارتقاء

کو اپنے سامنے وقوع پذیر ہوتے دیکھا۔ اگرچہ اِس مقام کی اپنی الگ تاریخ ابھی پوری طرح تحریر نہیں ہوئی، لیکن مکران کی تاریخ میں اِس کی جگہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

موجودہ صورتِ حال، ثقافتی اہمیت اور مستقبل کے امکانات

سنگِ سیاہ آج بھی اپنی فطری ہیئت کے ساتھ تلار کے قریب خاموشی سے ایستادہ ہے۔ وقت نے اِس کے گرد انسانی زندگی کے کئی رنگ بدلے، راستے تبدیل ہوئے، بستیاں پھیلیں اور جدید شاہراہیں وجود میں آئیں، مگر یہ پہاڑی اپنی اصل شناخت کے ساتھ باقی رہی۔ اِس کے باوجود سنگِ سیاہ اُن مقامات میں شامل ہے جن پر سرکاری، تعلیمی یا آثارِ قدیمہ کے اداروں کی جانب سے خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اِس کی تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی اہمیت آج بھی زیادہ تر مقامی یادداشت تک محدود ہے۔

مکران کے دیہی معاشرے میں پہاڑ محض جغرافیائی اکائیاں نہیں ہوتے بلکہ اجتماعی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ اِن سے راستوں کی شناخت وابستہ ہوتی ہے، بارشوں کے موسم کا اندازہ لگایا جاتا ہے، چراگاہوں کی تقسیم متعین ہوتی ہے اور مقامی لوگ اِن ہی قدرتی نشانات کے ذریعے اپنے علاقے کو پہچانتے ہیں۔ سنگِ سیاہ بھی اِسی روایت کا حصہ ہے۔ اگرچہ اِس کے بارے میں تحریری مواد کم ہے، لیکن مقامی آبادی کے لیے یہ ایک معروف جغرافیائی نشان ہے۔

سنگِ سیاہ کی سب سے بڑی اہمیت اِس کا قدرتی منظر نامہ ہے۔ مکران کے بیش تر پہاڑوں کی طرح یہاں بھی خشک مگر دل کش جغرافیہ، پتھریلی ڈھلوانیں، موسمی ندی نالے اور مقامی نباتات پائی جاتی ہیں۔ بارشوں کے بعد اِرد گرد کی وادیاں عارضی طور پر سرسبز ہو جاتی ہیں اور یہ منظر اِس خطے کی سخت گیر زمین میں زندگی کی نئی علامت بن کر اُبھرتا ہے۔ یہی قدرتی تنوع اِس علاقے کو ماحولیاتی اور سیاحتی اعتبار سے بھی اہم بناتا ہے۔

بدقسمتی سے بلوچستان کے بہت سے تاریخی اور قدرتی مقامات کی طرح سنگِ سیاہ بھی منظم دستاویزی توجہ سے محروم ہے۔ نہ اِس کی تاریخی حیثیت پر جامع تحقیق ہوئی ہے، نہ اِس کے جغرافیا کو مقامی سیاحت سے جوڑا گیا ہے اور نہ اِس مقام کی ثقافتی اہمیت کو محفوظ کرنے کی کوئی مؤثر کوشش سامنے آئی ہے۔ حالانکہ اگر اِس علاقے کا باقاعدہ سروے کیا جائے تو ممکن ہے یہاں قدیم راستوں، انسانی سرگرمیوں یا دیگر آثار سے متعلق نئے شواہد سامنے آئیں۔

سیاحت کے نقطۂ نظر سے بھی سنگِ سیاہ میں خاصے امکانات موجود ہیں۔ گزشتہ چند برسوں میں بلوچستان کے قدرتی مقامات کی طرف ملکی سیاحوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ ہن گول نیشنل پارک، پرنسز آف ہوپ، گوادر، تربت اور مکران کو سٹل ہائی وے نے اِس رجحان کو مزید تقویت دی ہے۔ اگر تلار اور سنگِ سیاہ جیسے مقامات کی بنیادی سہولیات، معلوماتی بورڈز اور محفوظ رسائی پر توجہ دی جائے تو یہ مقام بھی مقامی سیاحت کا حصہ بن سکتا ہے۔ تاہم ایسی کسی بھی سرگرمی میں قدرتی ماحول اور مقامی ثقافت کے تحفظ کو اولین ترجیح دینا ضروری ہوگا۔

سنگِ سیاہ کی ایک اور اہم جہت اِس کا علمی اور تحقیقی پہلو ہے۔ بلوچستان کے بہت سے تاریخی مقامات کی طرح اِس پہاڑی کے بارے میں معلومات زیادہ تر زبانی روایات، مقامی مشاہدات اور منتشر حوالوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ جامعات، آثارِ قدیمہ کے ماہرین، ارضیات کے محققین اور مقامی دانش ور مشترکہ طور پر اِس علاقے کا مطالعہ کریں۔ اِس ضمن میں مقامی بزرگوں کے انٹرویوز، قدیم راستوں کی نشان دہی، جغرافیائی سروے اور آثارِ قدیمہ کی ابتدائی تحقیق اہم نتائج دے سکتی ہے۔

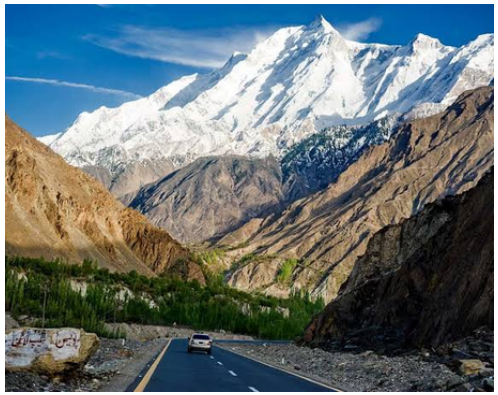
حقیقت یہ ہے کہ سنگِ سیاہ صرف ایک پہاڑی نہیں بلکہ مکران کی اجتماعی یادداشت کا حصہ ہے۔ ایسے مقامات کسی بھی خطے کی شناخت کو گہرا کرتے ہیں کیونکہ وہ ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ تاریخ صرف بڑی سلطنتوں، جنگوں اور حکمرانوں کا نام نہیں بلکہ اُن خاموش مقامات کی بھی اپنی تاریخ ہوتی ہے جو صدیوں تک انسانی زندگی کے ساتھ جڑے رہتے ہیں۔ اگر ہم اِن مقامات کو فراموش کر دیں تو دراصل اپنی مقامی تاریخ کا ایک اہم باب بھی کھو دیتے ہیں۔

اِسی لیے سنگِ سیاہ کی حفاظت صرف ایک قدرتی مقام کے تحفظ کا مسئلہ نہیں بلکہ مکران کے تاریخی، ثقافتی اور جغرافیائی ورثے کو محفوظ رکھنے کی ایک ذمہ داری بھی ہے۔ آنے والے برسوں میں اگر اِس مقام پر تحقیق، دستاویز سازی اور مناسب منصوبہ بندی کی جائے تو یہ نہ صرف علمی حلقوں کی توجہ حاصل کر سکتا ہے بلکہ مقامی آبادی میں اپنی تاریخ اور ثقافت کے بارے میں شعور پیدا کرنے کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

بشکریہ پی بی سی کوئٹہ

سیاحت اور ہماری ذمہ داری

تحریر: فاکہہ قمر



گھومنا پھرنا انسانی جبلت کا ایک اہم عنصر ہے کیونکہ انسان تو معاشرتی حیوان واقع ہوا ہے وہیں سیاحت اور ایڈونچر کا جذبہ اُس کے رگ و پے میں پایا جاتا ہے۔

سیاحت ہمیشہ سے ہر کسی کا مرغوب مشغلہ رہا ہے خصوصاً نوجوان نسل تو اِس کے دلدادہ ہیں۔

جب بھی سیاحت کا پروگرام مرتب ہوتا ہے بوریت کہیں دُور رہ جاتی ہے اور طبیعت میں بشاشت نمایاں نظر آتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ ڈپریشن کے مریض اور زندگی سے اُکتائے لوگ دوا سے زیادہ سیاحت کو ترجیح دیتے ہیں۔

سیاحت درحقیقت ایک تفریح تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک معاشرتی تجارت کا بھی حصہ ہے جس کا حصول نہ صرف مختلف ممالک اور ثقافتوں کو قریب لانے بلکہ معاشی فوائد اُجاگر کرنے، روزگار کے مواقع کی اہمیت بتانے، تاریخی، ثقافتی اور قدرتی ورثے کے تحفظ کا شعور اُجاگر کرنے، ذمہ دار اور پائیدار سیاحت کی حوصلہ افزائی کرنے کا بھی ذریعہ ہے۔

پاکستان میں سیاحت کے بے شمار مقامات موجود ہیں، جیسے شمالی علاقہ جات، وادیاں، جھیلیں، پہاڑ، تاریخی مقامات اور صوفی و ثقافتی ورثہ۔ پاکستان میں سیاحت نہ صرف ملکی معیشت بلکہ مقامی لوگوں کے روزگار اور اُن کے مثبت تشخص کو بھی فروغ دیتا ہے۔

سیاحت صرف خوبصورت مقامات کی سیر کا نام نہیں بلکہ قدرت، ثقافت اور مقامی لوگوں کا احترام بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ جب ہم کسی سیاحتی مقام پر جاتے ہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری ایک چھوٹی سی لاپرواہی اِس خوبصورتی کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اِس ضمن میں ہم پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہیں جو عالمی دن کے حوالے سے بے حد اہم ہیں۔

کچرا اِدھر اُدھر نہ پھینکیں، صفائی کا خیال رکھیں۔

درختوں، پودوں اور قدرتی ماحول کو نقصان نہ پہنچائیں۔

تاریخی و ثقافتی مقامات کی حفاظت کریں۔

مقامی لوگوں، اُن کی روایات اور ثقافت کا احترام کریں۔

پلاسٹک اور غیر ضروری اشیاء کے استعمال کو کم کریں۔

تصاویر لیتے وقت دوسروں کی نجی زندگی اور مقدس مقامات کا احترام کریں۔

جانوروں اور پرندوں کو تنگ یا نقصان نہ پہنچائیں۔

جگہ کو ویسا ہی خوبصورت چھوڑیں جیسا آپ نے اُسے پایا تھا۔

یہ وہ بنیادی اُصول ہیں جو کسی بھی سیاح کو سیاحت کے دوران لازم ذہن نشین کرنے چاہیے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ:

"اچھا سیاح وہ نہیں جو صرف خوبصورت مناظر دیکھے، بلکہ وہ ہے جو اِن مناظر کی خوبصورتی برقرار رکھنے میں اپنا کردار ادا کرے۔"

ہمارے نوجوان جہاں پر میدان میں اپنا آپ منوانے کی ہمت و جرأت رکھتے ہیں وہیں سیاحت کے فروغ میں سب سے مؤثر کردار بھی ادا کر سکتی ہے، کیونکہ نوجوان ٹیکنالوجی، سوشل میڈیا اور تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ ایسے میں سوشل میڈیا کا مثبت استعمال کر کے پاکستان کے خوبصورت مقامات، تاریخی عمارتوں، ثقافت اور روایات کی تصاویر اور ویڈیوز بنا کر دنیا تک پہنچائی جا سکتی ہیں۔

نئے سیاحتی مقامات متعارف کروائے جا سکتے ہیں۔ اپنے علاقے کے کم معروف مگر خوبصورت مقامات کو اُجاگر کر سکتے ہیں۔

ذمہ دار سیاحت اپنانے کے لیے صفائی کا خیال رکھیں، کچرا نہ پھینکیں اور قدرتی ماحول کو نقصان سے بچائیں۔

تاریخ اور ثقافت کو بھی فروغ دیں۔ مقامی زبان، لباس، کھانوں، دستکاری اور تاریخی ورثے کو دوسروں سے متعارف کروائیں۔

مقامی لوگوں کی مدد کریں۔ مقامی گائیڈز، ہوٹلوں، ریسٹورنٹس اور دستکاروں کی خدمات استعمال کر کے مقامی معیشت کو بھی مضبوط کریں۔

ٹریول بلاگنگ اور وی لاگنگ کے ذریعے نوجوان اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے پاکستان کا مثبت اور خوبصورت تشخص دنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔

سیاحتی ذمہ داری کا شعور فراہم کریں۔ محفوظ سفر، قوانین کی پابندی اور قدرتی و تاریخی مقامات کے تحفظ کا پیغام عام کریں تاکہ سیاحت کا اصل مقصد فروغ پا سکے۔

کہا جاتا ہے کہ:

"سفر انسان کو نئی جگہوں سے ہی نہیں، نئی سوچ اور نئے تجربات سے بھی روشناس کرواتا ہے۔"

اِس لیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کو مزید حسین بنائیں اور کچھ نئے تجربات سے لطف اندوز ہوں تو رختِ سفر باندھ لیں لیکن یاد رکھیں کہ بطور سیاح آپ کی کچھ ذمہ داریاں ہیں جن کو ہر صورت ادا کرنا آپ پر عائد ہے۔ بطور شہری یہ آپ کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ قدرتی حُسن کی حفاظت ہی ہماری بقاء ہے۔

بشکریہ پی بی سی سیالکوٹ

امر گیت نگار :احمد راہی

تحریر : محمد ظہیر بدر

مردم خیز شہر لاہور کے شمال مشرق میں کوئی بتیس میل کے فاصلے پر آباد شہر امر تسر جو صوفی غلام مصطفی تبسم ، غلام عباس،عارف عبدالمتین ،اے حمید، ظہیر کاشمیری ،سیف الدین سیف،احمد مشتاق،خواجہ محمد زکریا، شہزاد احمد ،احمد راہی جیسے اہلِ علم وادب کا ملد و مسکن رہا۔ وہیں ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر ،صاحبزادہ محمود الظفر،ڈاکٹر رشید جہاں، فیض احمد فیض، ممتاز مفتی، ساغر صدیقی اور سعادت حسن منٹو جیسے ادیبوں نے علم وادب کی انجمن سجائی اور پھر لاہور ریڈیو سٹیشن کے قیام اور لاہور میں فلم سازی کے باعث امر تسر سے ادیبوں کی آمد ورفت معمول بن گئی۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کے وقت امر تسر سے لاہور ہجرت کرنے والے ادیبوں اور شاعروں کو نئے دیس میں کسی قسم کی مغائرت کا احساس نہ ہوا۔

اُن ہجرت کرنے والوں میں سرِ فہرست ایک نام احمد راہی کا ہے۔ احمد راہی 12 نومبر 1923ء کو امر تسر میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد خواجہ عبدالعزیز نے اُن کا نام غلام احمد جبکہ اُن کے روحانی پیشوا نے خورشید احمد رکھا۔ احمد راہی نے میٹرک کرنے کے بعد 1942ء میں ایم اے او کالج امر تسر میں داخلہ لے لیا۔ اُس وقت ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کالج کے پرنسپل تھے جبکہ ڈاکٹر رشید جہاں، صاحبزادہ محمود الظفر اور فیض احمد فیض اساتذہ کے طور پر اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔

احمد راہی کی دورِ طالب علمی کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اُن کا رجحان درسی پڑھائی کے برعکس شعر وادب کی طرف زیادہ تھا۔ اُنہوں نے امر تسر میں منٹو، سیف الدین سیف اور اے حمید کی صحبت میں کہانی لکھنے کا ادراک حاصل کیا۔ ہجرت کے بعد لاہور سے شائع ہونے والے ادبی میگزین سویرا میں بطور ایڈیٹر ملازمت اختیار کرلی۔ یہاں اُنہوں نے جان پہچان کے عنوان سے جن ادیبوں اور شاعروں پر مختصر تعارفی مضامین لکھے اُن میں امرتا پریتم، بلونت سنگھ، زہرہ نگار، حنیف رامے، اداجعفری، احمد ندیم قاسمی، فراق گورکھپوری، کیفی اعظمی، فکر تونسوی اور ممتاز مفتی سمیت بہت سے ادیبوں کے نام شامل ہیں۔ پاک ٹی ہاؤس لاہور میں اُنہیں سیف الدین سیف، سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض کے علاوہ، ساحر لدھیانوی، منیر نیازی، اے حمید، اشفاق احمد، ابنِ انشائ، ناصر کاظمی جیسے نامور ادیبوں کی صحبت میسر آئی۔

فنی اعتبار سے احمد راہی کی شخصیت دو پہلوؤں کو محیط ہے۔ شاعر اور گیت نگار 1952ء میں شائع ہونے والے اُن کے پنجابی شاعری کے پہلے مجموعے "ترنجن" کو پنجابی کلاسیک کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ اِس کتاب پر اُن کی فرمائش پر سعادت حسن منٹو نے پاکوئی زبان میں فلیپ تحریر کیا ہے جو اُردو کے اِس عظیم افسانہ نگار کی پہلی اور آخری پنجابی تحریر ہے۔ ترنجن کا پہلا حصہ پنجاب کی الہڑ مٹیاروں کے الہڑ جذبات اور پنجاب کی ثقافت کا عکاس ہے جبکہ دوسرا حصہ اِنہی الہڑ دوشیزاؤں پر آزادی کے وقت سرحد کے دونوں اطراف ڈھائے گئے ظلم اور خونریزی کی المناک تصویر ہے۔ ترنجن کی شاعری پر حکومتِ پاکستان کی طرف سے پرائڈ آف پرفارمنس کے اعزاز سے نوازا گیا۔ علاوہ ازیں اُنہیں متعدد فلم ایوارڈز بھی دیے گئے۔ احمد راہی نے اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں شاعری کی اور گیت لکھے۔ اُن کا اُردو کلام کا مجموعہ "رگِ جاں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ احمد راہی کے اُردو مجموعہ کلام رگِ جاں کے دیباچے میں مشہور فلمی گیت نگار خواجہ پرویز نے قرار دیا ہے کہ احمد راہی کی ترنجن اور فلمی شاعری ادب کے اعلیٰ معیار پر ہر طرح سے پوری اترتی ہے۔

جہاں تک اُن کی گیت نگاری کا تعلق ہے تو احمد راہی نے اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں بہت مقبول گیت لکھے۔ لیکن اُن کی اصل پہچان اُن کے وہ پنجابی گیت بنے جو آج بھی سماعتوں میں رس گھولتے اور روح کے گنبد میں گونجتے ہیں۔



نمی نمی وا دگدی اُن کا سدا بہار گیت ہے جو جب بھی سنیں دل کو بھلا لگتا ہے۔ اِسی طرح اُنہوں نے عام طور پر پرانے لوک گیتوں کو ایک نیا روپ دے کر نئی زندگی بخشی۔ اُن کے کلام میں سوز، تڑپ، رس اور لوچ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اُن کی پنجابی شاعری کے ایک مجموعے کا نام "نمی نمی وا" اِسی گیت کے مکھڑے کی یاد دلاتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے بقول احمد راہی صرف پڑھے لکھے لوگوں کا ہی شاعر نہیں بلکہ وہ عام لوگوں کی بات بھی کرتا ہے۔

احمد راہی کی فلمی شاعری کا آغاز 1950ء میں مسعود پرویز کی فلم "بیلی" سے ہوا۔ لیکن اُن کو پہلی کامیابی 1956ء کی فلم "ماہی منڈا" میں عنایت حسین بھٹی کے گائے ہوئے گیت سے ملی۔

موسیقار بابا جی اے چشتی کے ساتھ اُن کی بہت اچھی جوڑی بنی، جس نے ایک سو سے زیادہ گیت بنائے جن کو فلمی موسیقی میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ علاوہ ازیں فلم "باجی ،مرزا جٹ اور ہیر رانجھا" کے لئے اُن کے لکھے ہوئے اور سلیم اقبال، رشید عطرے اور خواجہ خورشید انور کی موسیقی میں سنورے ہوئے گیت دنیائے موسیقی کا انمول اثاثہ ہے۔

احمد راہی نے مجموعی طور پر 91 فلموں کے لیے 331 گیت لکھے۔ اُن میں 102 گیت اُردو جبکہ 229 گیت پنجابی زبان میں ہیں۔ اُن کی مشہور فلموں میں " پینگاں، پلکاں، وحشی، سوسائٹی، سہتی، ماہی منڈا، یکے والی، چھومنتر، قیدی، باجی، یتیم، سسی پنوں، مراد بلوچ، نکے ہندیاں دا پیار، مرزا جٹ، ہیر رانجھا، بہادر کسان، ناجو، دل دیاں لگ یاں، وچھوڑا، اور جادو، کمانڈر، بازارِ حسن، چن ماہی نکی جئی ہاں" وغیرہ شامل ہیں۔ احمد راہی کے گیت غنائیت اور موسیقی سے بھرپور ہیں۔ احمد راہی 79 برس کی عمر میں 2 ستمبر 2002ء کو لاہور میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر لاہور کے تاریخی قبرستان میانی صاحب میں آسودہ خاک ہوئے۔ اُن کے لکھے ہوئے گیت آج بھی شائقینِ موسیقی کے لیے سرور دل کا سامان اور ترنجن کی نظمیں پنجابی لوک ادب کا اثاثہ ہیں۔

بشکریہ پی بی سی لاہور

کب آؤ گے مورا تم بن جیا را اُداس

استاد امانت علی خاں۔پٹیالہ گھرانے کے نامور فنکار

تحریر:پروفیسر سلیم الرحمن

فنونِ لطیفہ میں موسیقی کا فن بہت اہم مع انتہائی دقیق اور مشکل ہوتا ہے۔ صدیوں سے یہ فن اپنی انفرادیت اور اظہار وابلاغ کے حوالے سے حُسن و جمال اور سحر کاری کا مظہر رہا ہے۔ کلاسیکی موسیقی کی گائیکی دراصل غنائیت، سُر، لے، تال اور جمال صدا کا حسین امتزاج ہوتی ہے۔ گلے کا سُریلا ہونا حق تو یہ ہے کہ عطیۂ الٰہی ہوتا ہے۔ اساتذۂ فن کی رہنمائی، فن کار کی لگن، خلوص اور محنتِ شاقہ اِس فن کو نکھار کر چار چاند کر دیتے ہیں۔ اِس فن سے صوری اور سمعی مناظر کو سماعت اور بصارت تک رسائی ملتی ہے۔

برصغیر پاک وہند میں صدیوں سے کلاسیکی موسیقی کے متنوع گھرانے اپنے اپنے اسلوب وآہنگ اور انداز سے اپنے فن کا لوہا منواتے رہے ہیں۔ کن رسیے اور سُر شناس ہمیشہ سے کلاسیکی گائیکی کے مختلف گھرانوں کے مداح اور پرستار رہے ہیں۔

کلاسیکی موسیقی کے یہ گھرانے صدیوں سے نسل در نسل اپنے فن کا مظاہرہ کر کے شائقین، مداحین اور کن رسیوں کو مسحور و مسرور کرتے رہے ہیں۔ اِنہی گھرانوں میں سے ایک نامور ترین گھرانہ پٹیالہ گھرانہ ہے جو شائقین اور سُر شناسوں کے لیے ہمیشہ ایک کشش، محبت اور عقیدت کا باعث رہا ہے۔ اُستاد امانت علی خان، اُستاد فتح علی خان موسیقی کے اِسی نامور گھرانے کے سُریلے گائیک تھے۔ دونوں بھائی مل کر جب راگ راگنیاں پیش کرتے تو حاضرین و سامعین جُھوم جُھوم اُٹھتے تھے۔ دونوں بھائیوں کی جوڑی ایک عرصے تک مل کر کلاسیکی موسیقی کی گائیکی سے بین الاقوامی سطح پر اپنے گھرانے اور اپنے ملک کا نام روشن کرتی رہی۔ بلاشبہ اُستاد امانت علی خان صاحب کے چھوٹے بھائی اُستاد فتح علی خان صاحب گائیکی کی باریکیوں کے حوالے سے بے مثال تھے، مگر اُستاد امانت علی خان کی مسحور کن شخصیت اپنی گائیکی کے اعتبار سے بڑی ہی منفرد اور ہمہ جہت تھی۔ خیال سے گیت تک کا جو سُریلا رس بھرا خوبصورت سفر اُستاد امانت علی خان نے طے کیا وہ نہ صرف بے مثال ہے بلکہ اُنہی کا حاصہ ہے۔ دوسرے موسیقی کے تمام گھرانے، اُن کے اساتذہ کرام، بے شک نہایت قابلِ احترام ہیں مگر پٹیالہ گھرانے کے اِس حسین و جمیل گائیک کی انفرادیت الگ تھی۔ اُن کی وجاہت اور اعلیٰ گائیکی کے فن کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا تھا۔ کلاسیکی موسیقی کے مختلف عظیم گھرانوں میں سے اُستاد امانت علی خان وہ پہلے اور آخری گائیک ہیں کہ جنہوں نے بنیادی طور پر کلاسیکی موسیقی کے بلند پایہ گائیک ہوتے ہوئے، نیم کلاسیکی موسیقی یعنی ٹھمری، دادرہ، پھر ہلکی پھلکی موسیقی میں غزل اور گیت تک گا کر اپنے سامعین، مداحین اور حتیٰ کہ ناقدینِ فنِ موسیقی کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ ماہرینِ موسیقی اور اِس فن کے ناقدین بالخصوص کلاسیکی گائیکی کے ناقدین، اِس فن کے اکابرین متفقہ طور پر اِس پہلو کو تسلیم کرتے ہیں کہ راگ راگنیاں گانے والے خاندانی گویے نیم کلاسیکی موسیقی تک تو اعلیٰ گا لیتے ہیں مگر غزل اور گیت کی گائیکی کو اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتے اور یہ بات بے بھی حقیقت، مگر خانصاحب نے غزلیں اور گیت گا کر فنِ موسیقی کے اِس پہلو کو بھی ذاتی طور پر غلط ثابت کر دیا۔ اِس کے پسِ منظر میں اُن کی انفرادیت اور کمال فنکار کار فرما تھا۔ یہ اعزاز اُن کے علاوہ کسی اور کلاسیکی گائیک کے حصے میں نہیں آیا۔ اُستاد امانت علی خان اپنے حقیقی چھوٹے بھائی اُستاد فتح علی خان کے ساتھ مل کر مختلف راگ راگنیاں پیش کر کے ایک سماں باندھتے تھے۔

اُستاد امانت علی خان 1929ء میں ریاست پٹیالہ میں پیدا ہوئے۔ خان صاحب پٹیالہ کو ہمیشہ "پتیاں والا" کہا کرتے تھے یعنی ایسا شہر جس میں درختوں کو بہتات تھی اور سڑکوں پر، راستوں پر بہت زیادہ



تعداد میں پتے گرتے رہتے تھے۔ اِس گھرانے کے سربراہ خان صاحب جرنیل علی بخش، خان صاحب کرنیل فتح علی خان یہ دونوں فنکار مہاراجہ پٹیالہ کے درباری گویے تھے۔ دونوں خان صاحبان اگرچہ آپس میں رشتہ دار نہیں تھے مگر ہمیشہ سگے بھائیوں کی جوڑی کی طرح جہاں جاتے اکٹھے جاتے اور اکٹھے گاتے اور یہ جوڑی سامعین کو اپنی گائیکی سے مسحور کر دیا کرتی تھی۔ یہ دونوں جرنیل کرنیل پہلے گوکھی بائی کے شاگرد ہوئے پھر بتدریج بہرام خان، مبارک علی خان اور تان رس خان کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرتے رہے اور خود کو موسیقی کی علمی و عملی تعلیم سے آراستہ کرتے رہے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے اُن کی بہت عزت افزائی کی اور اُنہیں جرنیل کرنیل کے خطاب سے نوازا۔ خان صاحب جرنیل علی بخش خان کے فرزندِ ارجمند اُستاد اختر حسین خان تھے۔ اُستاد امانت علی خان، اُستاد فتح علی خان، اُستاد حامد علی خان اُستاد اختر حسین خان کے سُریلے فرزندان ہیں اور اِس حقیقی نسبت سے تینوں بھائی جرنیل علی بخش خان کے پوتے لگتے ہیں۔

تقسیمِ برصغیر کے وقت پٹیالہ گھرانہ ہجرت کر کے شہرِ نگاراں، شہرِ فنکاراں لاہور آن بسا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ دونوں بھائیوں نے اپنے والد مکرم اُستاد اختر حسین خان سے موسیقی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ کمسنی میں ہی کلاسکی موسیقی اور راگ راگنیوں کی گائیکی کے اسرار و رموز سیکھنے لگے۔ شب و روز کی محنتِ شاقہ، کڑی ریاضت نے اُن کے سُریلے مادر زاد نورانی گلے کو ایسی جِلا بخشی کہ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ ماہرِ موسیقی دان، فنکار گراور ریڈیو پاکستان لاہور کے ریٹائرڈ ڈپٹی کنٹرولر محترم سید محمد اسلام شاہ صاحب مرحوم و مغفور اپنی دقیق معلوماتی اور حُسنِ اختصار سے مزین تصنیف "نامور فنکار" میں لکھتے ہیں۔

"اُستاد امانت علی خان کو اللہ نے انتہائی رس بھری آواز عطا کی ہے۔ وہ اِس آواز سے ملہپت اور آلاپ میں وہ جادو جگاتے ہیں کہ ساتھ بیٹھے ہوئے اُن کے چھوٹے بھائی فتح علی خان گانا چھوڑ کر اُس سے لطف لینا شروع کر دیتے ہیں اور سامعین اُن کی آواز کے تانے بانے میں گم ہو جاتے ہیں۔ فتح علی خان کے گانے میں ایک انفرادیت ہے کہ جوں جوں لے بڑھتی چلی جاتی ہے اُن کی آواز اور اُن کا فن کھلتا جاتا ہے اور مشکل سے مشکل تانیں تیز تیز لے میں صاف اور شفاف انداز میں عمدہ طریقے سے ادا کر جاتے ہیں۔ مرکیاں اور تانے پلٹے اُن کی آواز کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں۔"

بہت ہی کم لوگ یہ جانتے ہوں کہ اُستاد امانت علی خان کئی زبانیں بڑی روانی کے ساتھ بول لیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ اُن کی شخصیت کے اِس پہلو سے واقف ہیں۔ اُن کی شخصیت کے کئی انوکھے پہلو تھے، اُن میں ایک حیران کر دینے والا پہلو اُن کا دیگر زبانوں پر عبور تھا۔ اِس ضمن میں بطور سند مسعود منور صاحب کے ایک لائقِ مطالعہ مضمون سے ایک اقتباس درج کر رہا ہوں۔ یہ مضمون محترمہ نسرین انجم بھٹی صاحبہ مرحومہ مغفورہ کی تالیف کردہ مختصر سی کتاب میں شامل ہے۔

کتاب کا نام ہے "موراتم بن جیارا اُداس"۔

یہ مختصر سی تالیف اُستاد امانت علی خان کے اِس دارِ فانی سے کوچ کرنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد قصۂ شہود پر آئی تھی۔ مذکورہ مضمون "مصنف مسعود منور صاحب" سے ماخوذ چند اقتباسات یہ ہیں۔

"امانت میرا دوست تھا مگر اُس کی دوستی میں ایک جھلک اُس دانشمند گرامی کی تھی جس کے پاس علم کی بے پناہ دولت تھی۔ امانت فارسی، پشتو، سندھی، بنگالی، بلوچی اور بروشکی زبانیں اِس مزے سے بولتا تھا کہ اِس ہفت زبانی پر رشک کرنے کو جی چاہتا تھا۔ زبانیں اُس نے کب سیکھیں، کس مکتب سے لسانیات کی سند حاصل کی، اِس کا کوئی ثبوت نہیں مگر اتنی بات اُس کے تمام ملنے جلنے والے جانتے ہیں کہ وہ بہت سی زبانوں میں بڑی بے تکلفی سے گفتگو کر سکتا تھا"

ایک اقتباس اور پڑھتے جائیں۔

"امانت کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں۔ یہ آنکھیں تھیں یادوں اگنیاں جو اپنے کلائمیکس پر آنکھوں میں ڈھل گئی تھیں۔ اِن محفلوں میں کبھی یہ آنکھیں راگ میں ڈھل جایا کرتی تھیں۔ تمام لوگ خاموش ہو جاتے اور امانت گانے لگتا۔ امانت کو اپنے طور پر راگ یا گیشری سے عشق تھا۔ اسے جب کبھی اپنی پسند کا راگ گانے کو کہا جاتا تو وہ یا گیشری گاتا۔ یا گیشری گاتے ہوئے اُس کی آنکھیں کسی سادھو کی طرح بند ہو جاتیں اور وہ کسی دوسری دنیا میں پہنچ جاتا۔"

اب سے قریباً بادن برس قبل موت نے بلمپت اور درجت کا یہ سُریلا اور رسیلا ساتھ ہمیشہ کے لیے چُھڑا دیا۔

شہرِ خاموشاں خاک تیری
کھا گئی کیسے کیسے لوگ

سرودیا کی کچھ نامور ہستیوں کو نہ دیکھ سکنے کے حوالے سے بعض اوقات مجھے اپنی محرومیوں کا احساس شدت پکڑ جاتا ہے۔ بہر حال الحمدللہ کہ خان صاحب کے چھوٹے بھائی اُستاد فتح علی خاں صاحب کے نیاز حاصل رہے۔ اُن سے ہم کلامی کا شرف حاصل رہا۔ اُن کی لائیو اناؤنسمنٹ کرنے کا اعزاز بھی ریڈیو پاکستان لاہور سے بطور اناؤنسر حاصل رہا مگر خان صاحب کی نیاز حاصل نہ ہو سکے۔

ابھی ابھی قریب ہی سے کسی صاحبِ ذوق کے گھر سے ایک غزل کی آواز آئی تھی مگر ایک ڈیڑھ منٹ کے بعد غزل کا والیوم یک دم دھیما ہو گیا اور پھر فضا میں پیدا ہونے والی ایک اچانک سی جگمگاہٹ کا چاند بھی یک دم گہنا گیا۔ محترم جناب رضی ترمذی صاحب مرحوم کی غزل تھی جس کے میوزک ڈائریکٹر اختر حسین اکھیاں تھے اور غزل سرا تھے پٹیالہ گھرانے کے نامور ترین، حسین ترین گائیک اُستاد امانت علی خان۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے گا۔

دل میں میٹھے میٹھے درد کے پھول کھلے
پھر یادوں کی ہوا چلی پھر شام ہوئی
کون پکارے گایوں تجھ کو دیکھ نہ جا
دل کی اِک اِک دھڑکن تیرا نام ہوئی
جب سے آنکھیں کھولیں نیند حرام ہوئی

جونہی غزل کانوں میں پڑی ایک دیرینہ پیچھتاوا آنکھوں کے سامنے ایک بھنور سا بنانے لگا اور بھنور میں پھنسی یادوں کی نیّا ہچکولے کھانے لگی کہ ایسی کشتیاں شاذ و نادر ہی ساحل تک پہنچا کرتی ہیں۔ اِسی گہرے بھنور کے ایک کھنگر وسے بازگشت آنے لگی کہ

آ میرے پیار کی خوشبو منزل پہ تجھے پہنچائے

میرے اِسی پچھتاوے میں کربِ مخفی یہ ہے کہ میں خان صاحب اُستاد امانت علی خان کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ حالانکہ جب وہ حیات تھے تب بھی میں ریڈیو لاہور میں طلبہ و طالبات کے پروگرام یونیورسٹی میگزین میں بڑی باقاعدگی سے شرکت کرتا تھا اور ہفتے میں کم از کم ایک ادبی پروگرام کی ریکارڈنگ میں حصہ لیا کرتا تھا مگر میری کم نصیبی کہ میں تب بھی خان صاحب کو دیکھ نہیں سکا۔ ویسے بھی خرابیٔ صحت کے باعث اُنہوں نے ریڈیو میں آنا جانا کم کر دیا تھا۔

خیال سے غزل کی گائیکی تک بلکہ گیت تک اُن کی ایک اپنی ہی ادا تھی۔ ایک اُن کا اپنا ہی اسلوب تھا جس کے وہ خود ہی موجد تھے اور خود ہی خاتم۔ وہ بلاشبہ ایک صاحبِ اسلوب گائیک تھے۔

اللہ تعالیٰ پروفیسر اسرار احمد مرحوم میوزک ڈائریکٹر اور اُستاد طبیعات کے درجات بلند فرمائے۔ راقم الحروف سے کہا کرتے تھے کہ پٹیالہ گھرانہ میں اتنا خوبصورت اور انٹلکچوئل گویّا شاید ہی دوبارہ جنم لے۔

1969ء میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے اُستاد امانت علی خان، اُستاد فتح علی خان کو تمغۂ حُسنِ کارکردگی دیا گیا۔ خان صاحب کی ریکارڈنگ کا سرمایہ گراں مایہ بے مثال ہے۔ اُنہوں نے اپنے چھوٹے بھائی اُستاد فتح علی خان کی سنگت میں جو راگ راگنیاں اور نیم کلاسیکی موسیقی میں جو ٹھمریاں گائیں وہ پٹیالہ گھرانہ کی مخصوص اور خوبصورت گائیکی کی عمدہ ترین نمائندگی کرتی ہیں۔ چند فلموں کے لیے بھی اُنہوں نے نغمہ سرائی کی۔ ملکۂ ترنم نور جہاں کے ساتھ نیم کلاسیکی اسلوب میں دوگانا گایا۔ ملکۂ غزل فریدہ خانم کے ساتھ نیم کلاسیکی اسلوب میں بے مثال نغمہ نوائی کی۔ ریڈیو اور ٹی وی کے لیے یادگار غزلیں، کچھ یادیں اور اُن کے فن کے کمال و جمال کا تذکرہ ملاحظہ فرمائیے۔

خان صاحب کی گائیکی فضا میں سوز و ساز بکھیر دیتی ہے۔ اُن کے اکار بلور کی طرح شفاف، صاف بے خراش اور چمکدار تھے۔ مادر زاد سُریلے گلے میں غضب کا سوز اثر اور مٹھاس تھی۔ داد طلبی کی بجائے گائیکی کی طرف مکمل توجہ اور انہماک اُن کے ظاہری حُسن و جمال کو چہار چند کر دیتا تھا۔ اُن کا جمالِ صوت دل و دماغ پر افسردگی طاری کر دیتا تھا۔ آلاپ ایسا کہ سماعت تک پہنچتے ہی سامع ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ اُن کی آواز افسردگی ضرور طاری کرتی تھی مگر پُرمردگی سے ہمیشہ پرے رکھتی تھی۔ اُن کی پُرگداز، دل نشین اور سُریلی آواز روح کو اُداس بھی کر دیتی تھی اور ساتھ ہی زندگی سے لبریز رہنے کا سندیسہ بھی دیتی تھی اور یہی حُسنِ تضاد اُن کے گلے کا معجزہ تھا۔

اب بھی جب خان صاحب کو سنتا ہوں تو مجھے اُن کی خوش الحانی پر قرآن حکیم کی سورہ نُور کی یہ آیت یاد آ جاتی ہے۔

جس کا ترجمہ ہے۔

(ترجمہ) "اور جب پرندے چہچہاتے ہیں تو یہ اپنے پروردگار کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں"

انشاء جی اُٹھو اب کوچ کرو
ہونٹوں پہ کبھی اُن کے میرا نام ہی آئے
موسم بدلا رت گدرائی
ایک خلش کو حاصل عمر رواں رہنے دیا
یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
کیسے گزر گئی ہے جوانی نہ پوچھیے
دل میں میٹھے میٹھے درد کے پھول کھلے
میری داستانِ حسرت وہ سُنا سُنا کر روئے
امیرے پیار کی خوشبو منزل پہ تجھے پہنچائے
پیار نہیں ہے سر سے جس کو وہ
ملی نغمات
اے شہیدانِ وطن
اے وطن پاک وطن
چاند میری زمیں پھول میرا وطن
ایہہ دھرتی میرا سونا یارو

ذرا غور فرمائیے گا یہ رَس بھری دل گداز غزلیں، دل میں اُتر جانے والی طرزیں اور اِن طرزوں میں نورانی گلے کی مسحور کن صدائیں جمالِ صوت، حُسن ندا، کمال نوا، بھلا کون صاحبِ ذوق، سُرشناس، قدردان سنو یا ہو گا جو یہ سب کچھ سن کر مسحور نہ ہوتا ہو گا۔

کئی غزلوں کی طرزیں خان صاحب نے خود موزوں کیں۔ کچھ میوزک ڈائریکٹرز نے بڑی لگن سے اُن کی ادائیگی اور اسلوب کو مدِ نظر رکھ کر بنائیں۔ اختر حسین اکھیاں اور خلیل احمد جیسے عظیم میوزک ڈائریکٹرز نمایاں نام تھے۔ ظاہر ہے کہ بنیادی طور پر خان صاحب پٹیالہ گھرانہ کے مایہ ناز کلاسیکل گائیک تھے سو یہی سبب ہے کہ وہ موسیقی کے عالم بھی تھے اور عامل بھی، اِسی پس منظر میں اُن کی تمام غزلیں، گیت، ملی نغمات کسی نہ کسی راگ راگنی میں بنائے گئے ہیں کہ یہی کلاسیکی آمیزش اُن کے شایانِ شان تھی۔

کمال فن کی انفرادیت کی معراج ملاحظہ ہو کہ بنیادی طور پر کلاسیکی موسیقی گانے والے ایک بہت اعلیٰ اور ممتاز ترین گائیک غزل سے گیت تک کو بھی دائمی حُسن اور حیاتِ جاوداں دے گئے۔

آپ کے بہت سے انگنت چاہنے والے 1974ء کے ستمبر میں شعوری اور لاشعوری طور پر قیاس کرنے لگ گئے تھے کہ آکاش پر بسنے والی سُریلی روحیں، فردوس گوش سُریلے پرندے، نغمہ داؤد سننے والی خوش بخت سماعتیں اور یعقوب کے نوحے سننے والی سماعتیں آپ کو وقفوں وقفوں سے کہنے لگی ہیں کہ کب آؤ گے موراتم بن جیارا اُداس۔۔۔

18 ستمبر 1974ء بروز بدھ بمطابق یکم رمضان المبارک پٹیالہ گھرانے کے اِس حسین ترین، ذہین ترین، بے مثل سُریلے فنکار کی رُوح صرف 45 برس کی عمر میں قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

جہانِ درد میں اب کیا رہا ہے
پرندہ شاخِ دل سے اُڑ گیا ہے

خان صاحب جی! عرش کی تو ربُ العرش ہی جانتا ہے، مگر فرش پر بیٹھ کر ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں نا کہ خان صاحب جی کب آؤ گے موراتم بن جیارا اُداس۔



بشکریہ پی ٹی وی لاہور

ڈرامے کی سنہری روایت کا پاسدار، عابد علی

پاکستانی ڈرامے کی تاریخ میں ایک ایسا اداکار جس کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی

تحریر: خرم سہیل



پاکستانی ڈرامے کی سنہری رِوایت کا ایک نام عابد علی تھے۔ وہ دور، جہاں اُن جیسے فنکار اپنے کام سے جنون کی حد تک مخلص تھے۔ جن کی نظر میں لگن سے کیا ہوا کام ہی وہ واحد راستہ تھا جس کے اختتام پر مداحوں کی عزت اور احترام اُن کے لیے منتظر ہوا کرتا تھا۔

17 مارچ 1952ء کو بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں پیدا ہونے والے عابد علی کی فنی خدمات قابلِ رشک ہیں۔ کوئٹہ میں تعلیم مکمل کی، اپنے اندر کے فنکار کو دریافت کرنے کی غرض سے تلاش کی اَن دیکھی منزل کو نکل پڑے۔ خوابوں کے کئی ریگستان اور اُمیدوں کے گلشن عبور کرتے ہوئے اپنے فنی سفر پر قائم رہے۔ کوئٹہ میں ریڈیو پاکستان سے فنی کیریئر کی ابتدا کی، ساتھ ساتھ زندگی کے منفرد رنگوں اور خوشبوؤں سے بھی متعارف ہوئے۔ تھیٹر اور فلم میں بھی کام کیا، لیکن شناخت کا حوالہ ٹیلی وژن بنا، جس کا تاثر عہدِ حاضر تک برقرار ہے۔ 1970ء سے 1973ء تک بطور میزبان ریڈیو پاکستان، کوئٹہ سے وابستہ رہے۔ اِس کے بعد رختِ سفر باندھا اور لاہور آ گئے۔ پاکستان ٹیلی وژن پر اپنے پہلے ڈرامہ "جھوک سیال" میں اداکاری کی، پھر یہ سلسلہ چل نکلا، لیکن اُنہیں "وارث" ڈرامے سے ملی جس کے ذریعے اُن کی اداکارانہ صلاحیتوں کا لوہا پاکستان بھر میں مان لیا گیا۔

1979-80ء میں نشر ہونے والے اِس ڈرامے نے اُن کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اُنہوں نے اِس میں "دلاور" کا کردار نبھایا اور خوب نبھایا۔ معروف شاعر اور ڈرامہ نگار امجد اسلام امجد کا لکھا ہوا یہ ڈرامہ پی ٹی وی کی سنہری تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جس میں پاکستان کے فنونِ لطیفہ کی منظر کشی گہرے رنگوں میں رنگی دکھائی دیتی ہے۔ اُن کے دیگر چند معروف ڈرامے، جن میں اُنہوں نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کے جوہر دکھائے، سمندر، آن، پاس، دوریاں، دشت، مہندی، مہمت، مورت، رُخصتی، خان صاحب، دیارِ دل، کچھ نہ کہو، ناگن، پنجرہ، دلدل، رمزِ عشق اور دیگر ہیں۔ مندرجہ بالا فہرست میں شامل ڈراموں میں ایک معروف ڈرامہ "دشت" تھا جس میں اداکاری کرنے کے ساتھ ساتھ عابد علی نے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کے فرائض بھی بخوبی نبھائے۔ یہ ڈرامہ معروف ڈرامہ نگار مُنو بھائی نے لکھا تھا۔ اِس کی کہانی بلوچستان کی روایات، عشق و محبت اور ریگستانوں میں بسے ہوئے قبیلوں کی روایات و رسومات کے احساسات کا داستانی بیان تھی۔ شاہ جی کا کردار نبھانے والے عابد علی اپنے کردار سے تصوف کے رنگ میں خود کو رنگنے میں خوب کامیاب رہے۔ معروف فنکاروں عتیقہ اوڈھو اور نعمان اعجاز کو ٹی وی کی اسکرین پر کامیابی حاصل کرنے میں اِس ڈرامے نے کلیدی کردار ادا کیا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ اِس ڈرامے کے ذریعے پاکستان کی تاریخی اور لازوال موسیقی تخلیق ہوئی، جس کو عظیم موسیقار واجد علی ناشاد نے مرتب کیا تھا، اِس کے علاوہ پاکستان کے معروف شاعر عطا شاد کی شاعری کو نغموں کی آواز بنایا گیا، جن میں ریگستانی حُسن اور محبت کے سراب کو قید کرنے کی خواہش پھڑپھڑاتی ہے۔ ایک ڈرامے میں اتنی ساری دلکش جہتوں کو سمونے والے ہدایت کار کے تعاقب میں ریگستانوں سے پھر کوئی اور نہ آ سکا۔ اِس ڈرامے کے ٹائٹل گیت سمیت کل چھ گیت تھے، جن کی موسیقی دل کے سارے دروازے کھول دے۔ اِس موسیقی کو سُن کر احساس ہوتا ہے کہ عابد علی اپنی ذات میں ایک حساس شخص تھے، جس کے خمیر میں اپنی دھرتی کی ثقافت اور تہذیب پنہاں تھی۔ وہ اِس سے عشق کرتے تھے۔ یہ ڈرامہ صرف نام ہی کا دشت نہیں بلکہ اُس دشت کو بھی پیش کر رہا تھا جس میں محبت پانی کا کنواں اور کیفیت ریگستان میں لاحق ہونے والی پیاس تھی جس کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ تھا، ایک طرف موت تو دوسری طرف پیاس مقابل تھی۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ ڈرامہ اپنے تہذیبی رچاؤ کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ عابد علی کا یہ بہت بڑا کریڈٹ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

موجودہ دور میں ڈرامہ سریل "سہیلی" کے ساتھ ساتھ "ماسی اور ملکہ" بھی اُن کی پروڈکشن کی صلاحیت کا مُنہ بولتا ثبوت ہیں۔ اُنہوں نے کم مگر معیاری کام کیا۔ تھیٹر کے شعبے میں مختصر اور ریڈیو پر بھی بہت تھوڑا کام کیا، لیکن ڈرامے کے بعد فلم کے شعبے میں سب سے زیادہ کام کیا۔ ٹیلی وژن اور فلم کا کیریئر ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ ایک موڑ پر آ کر اُن کی فلم اپنے ڈرامے سے پیچھے رہ گئی، اُنہوں نے پھر بھی جو کام کیا، وہ قابلِ ستائش ہے۔ فلم کے شعبے میں جن فلموں میں اپنے اداکارانہ فن کو ثابت کرنے میں کامیاب رہے، اُن میں 1979ء میں نسیم حجازی کے ناول پر بننے والی فلم "خاک اور خون" شامل تھی، اِس کے علاوہ وہ جن فلموں میں جلوہ گر ہوئے، اُن میں گمنام، آواز، روٹی، گیمبیہ، انسانت کے دشمن، کالے چور، وطن کے رکھوالے، کوبرا، شیر پنجاب دا، جنگل کا قانون، موسیٰ خان اور دیگر فلمیں شامل ہیں۔ میں نے جب 2005ء میں جامعہ کراچی میں داخلہ لیا اور صحافت کی تعلیم حاصل کر رہا تھا، اُن دنوں کچھ دوستوں کے ساتھ سُپر ہائی وے پر واقع ریستوران پر کھانا کھانے گیا تو حسین اتفاق ہے، اُسی ریستوران پر عابد علی بھی اپنے خاندان کے ہمراہ تشریف لائے ہوئے تھے، چونکہ وہ ہم سے ذرا ہی فاصلے پر تشریف فرما تھے، میں بہت اشتیاق سے اُنہیں دیکھتا رہا، جس طرح وہ نرم دلی اور دھیمے انداز لیکن کھنکتی آواز میں، چہرے پر مُسکان سجائے، کھانے کا آڈر دے رہے تھے اور ہم نے بھی اُن سے رسمی علیک سلیک کی تو اُس کا جواب بہت مثبت انداز میں دیا جس سے اندازہ ہوا، وہ اچھے فنکار ہی نہیں، انسان بھی عمدہ تھے۔ یہ تو ایک دُھندلی سی یاد تھی، لیکن جو یاد میرے ذہن کے پردے پر پوری طرح روشن ہے، وہ یاد اُن دنوں کی ہے، جب میں نے صحافت میں نیا نیا قدم رکھا۔ اُن دنوں انٹرویو کے سلسلے میں، مجھے عابد علی سے بات کرنے کا موقع ملا۔ یہ اپنی شوٹنگز میں مصروف تھے۔ اُن سے ملاقات کا وقت لینے کی غرض سے میں نے متعدد بار فون کیا، پھر ایک سطح ایسی آ گئی، جہاں وہ میرے نام اور آواز سے مانوس ہو گئے اور ایک دن فون پر ہی کہنے لگے "ایسا کرتے ہیں، مصروفیت تو نہ جانے کب ملاقات کی مہلت دے، لہذا ہم فون پر ہی مکالمہ کر لیتے ہیں۔" میں نے خوشی خوشی ہامی بھر لی۔ یوں میں نے اُن سے ایک مختصر اور بنیادی نوعیت کا انٹرویو کیا۔ جس محبت اور شفقتِ پدری سے اُنہوں نے گفتگو کی، اُس دن مجھے پھر احساس ہوا، وہ ایک انسان دوست شخصیت ہیں، جن کی قد آور شخصیت ہمارے ہاں نوادر لوگوں کے لئے بھی مہربان ہے۔ اُن کی شفقت، سخاوت اور محبت بھرے انداز سے ایک زمانہ واقف ہے۔ عابد علی پاکستان کے ٹیلی وژن اور فلم کی اسکرین کا ایک ایسا چہرہ تھے، جن کو وقت کی گرد کبھی دھندلا نہیں سکے گی، کیونکہ اُن کے ادا کئے ہوئے کردار ہمارے سامنے آتے اور جاتے رہیں گے، بالکل اِسی طرح، جیسے یہ احساس ہے کہ وہ کہیں نہیں گئے، بلکہ اُن کا جانا بھی کسی کردار کی ادا ہے جس کو ادا کر کے وہ واپس آ جائیں گے، لیکن یہ شاید میرا گمان ہے، حقیقت نہیں ہے، کورنکہ وہ دنیا کے اسٹیج پر، زندگی کے پنڈال سے، اپنے کام کی معراج کو چُھو کر واپس لوٹ چکے۔ اب اُن جیسا کوئی نہیں آئے گا۔ مداحوں کو اُن کے جانے کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ یہی وہ سچی کمائی ہے جس کو عابد علی نے اپنی ریاضت سے حاصل کیا۔ دل کو بہلانے کے لیے اُن کی یاد، تصور کے منچ پر، اُن کے کرداروں کو ایک ایک کر کے واپس لاتی رہے گی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک عظیم فنکار اپنی کہانی مکمل کر کے رُخصت ہو چکا، منچ ویران ہے، کہانی اداس اور کردار خاموش۔

بشکریہ پی بی سی، کراچی

ریڈیو پاکستان گلگت میں محفلِ مدحتِ مصطفیٰ ﷺ کا انعقاد

تحریر: ڈاکٹر شیر دل خان



ربیع الاول 1448 ہجری کی مناسبت سے 11 ربیع الاول 25 اگست کو ریڈیو پاکستان گلگت کے اسٹوڈیوز میں ایک روح پرور اور بابرکت نعتیہ محفل بعنوان "محفلِ مدحتِ مصطفیٰ ﷺ" کا انعقاد کیا گیا۔ اِس بابرکت محفل میں گلگت شہر کے مختلف تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے نعت خواں طالبات نے شرکت کی اور بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں گلہائے عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ نعت خواؤں کی پُر سوز آوازوں اور عقیدت و محبت سے بھرپور کلام نے محفل کی روحانی کیفیت کو مزید دلنشیں بنا دیا۔

محفلِ مدحتِ مصطفیٰ ﷺ کی میزبانی کے فرائض ڈاکٹر فضہ مسلم نے انجام دیے، جبکہ معروف دینی اسکالر رابعہ یوسف نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ اُنہوں نے اپنے خطاب میں سیرتِ طیبہ اور موجودہ دور کے تقاضوں کے حوالے سے تفصیلی روشنی ڈالی۔

اُنہوں نے کہا کہ حضور اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہمارے لیے زندگی کے ہر شعبے میں بہترین رہنمائی کا سرچشمہ ہے اور آج کے دور میں محبتِ رسول ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کی تعلیمات، اخلاق اور اسوۂ حسنہ کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

محفل کے دوران نعت خواؤں نے حضور نبی کریم ﷺ کی شانِ اقدس میں عقیدت کے پھول نچھاور کیے جس سے ریڈیو پاکستان گلگت کے اسٹوڈیوز ایک روحانی اور نورانی ماحول میں ڈھل گئے۔

محفلِ مدحتِ مصطفیٰ ﷺ کا بنیادی مقصد ربیع الاول کی بابرکت ساعتوں میں محبتِ رسول ﷺ کو اُجاگر کرنا، نئی نسل کو سیرتِ طیبہ سے روشناس کرانا اور حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات کو معاشرے میں فروغ دینا تھا۔ یہ خوبصورت محفل سامعین کے لیے بھی محبت، عقیدت اور سیرتِ رسول ﷺ سے وابستگی کا ایک یادگار پیغام ثابت ہوئی۔





یومِ آزادی: مزارِ قائد پر تبدیلیٔ گارڈز کی تقریب

رپورٹ: الطاف حسین لغاری

یومِ آزادی کے موقع پر کراچی میں صبح کا آغاز بابائے قوم قائدِاعظم محمد علی جناح کے مزار پر ایک پُروقار تقریب سے ہوا جہاں تبدیلیٔ گارڈز کی روایتی تقریب منعقد ہوئی۔ پاکستان نیول اکیڈمی کے چاق و چوبند دستوں نے ذمہ داریاں سنبھالیں۔ تقریب کے مہمانِ خصوصی کمانڈنٹ پاکستان نیول اکیڈمی ریئر ایڈمرل محمد عمیر تھے جنہوں نے مزارِ قائد پر حاضری دی، فاتحہ خوانی کی اور بابائے قوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

تقریب کے دوران پاکستان نیول اکیڈمی کے دستوں نے شاندار فوجی نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزارِ قائد پر گارڈز کے فرائض سنبھالے۔ قومی پرچم کی سربلندی اور پاک بحریہ کے جوانوں کا پُروقار انداز تقریب کے حُسن میں اضافہ کر رہا تھا۔

تبدیلیٔ گارڈز کی یہ تقریب ہر سال یومِ آزادی کے موقع پر منعقد کی جاتی ہے اور اس کا مقصد بابائے قوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ وطنِ عزیز کی آزادی، خود مختاری اور سلامتی کے تحفظ کے عزم کی تجدید بھی ہے۔

ریئر ایڈمرل محمد عمیر نے اِس موقع پر مہمانوں کی کتاب میں اپنے تاثرات بھی قلم بند کیے۔

مزارِ قائد پر موجود شہریوں نے قومی پرچم لہرا کر پاکستان سے اپنی محبت کا اظہار کیا، جبکہ بچوں اور نوجوانوں سمیت شہریوں کی بڑی تعداد نے تقریب میں شرکت کی اور قومی جوش و جذبے کے ساتھ یومِ آزادی منایا۔





یہ تقریب اِس عزم کی عکاس تھی کہ پاکستان کی مسلح افواج اور عوام وطنِ عزیز کی سلامتی، خود مختاری اور ترقی کے لیے متحد ہیں۔

یومِ آزادی ہمیں یاد دلاتا ہے کہ پاکستان بے شمار قربانیوں کے نتیجے میں حاصل ہوا۔ قائدِاعظم محمد علی جناح کی قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں نے ایک آزاد وطن کے حصول کے لیے تاریخی جدوجہد کی جس کے نتیجے میں 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔

آج مزارِ قائد پر تبدیلیٔ گارڈز کی یہ پُروقار تقریب ہمیں اُس عظیم جدوجہد اور قومی ذمہ داریوں کی یاد دلاتی ہے جس کی بدولت ہمیں ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔

ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم قائدِاعظمؒ کے اصول اتحاد، ایمان اور نظم و ضبط کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنائیں اور پاکستان کی ترقی و خوشحالی کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔

مزارِ قائد پر یومِ آزادی کی صبح منعقد ہونے والی یہ تقریب وطن سے محبت، قومی یکجہتی اور پاکستان کے دفاع کے عزم کی خوبصورت تصویر پیش کر رہی تھی۔

کوریج: ثناءاللہ ابڑو
انجینئرز: فاروق چشتی، زین العابدین
بشکریہ پی بی سی کراچی



ریڈیو پاکستان گلگت میں یومِ آزادی کی خصوصی تقریب

رپورٹ: واجد علی





ریڈیو پاکستان گلگت میں یومِ آزادی پاکستان کے موقع پر ایک پُروقار تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں مختلف اسکولوں کے طلبا و طالبات نے شرکت کی۔ اِس موقع پر ریڈیو پاکستان گلگت کی عمارت اور اسٹوڈیوز کو قومی پرچم، سبز و سفید بینرز اور غباروں سے خوبصورتی سے سجایا گیا۔

ڈپٹی اسپیکر گلگت بلتستان اسمبلی ملک کفایت الرحمان نے تقریب میں بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ اپنے خطاب میں اُنہوں نے کہا کہ یومِ آزادی ہمارے لیے تجدیدِ عہد کا دن ہے۔ ہمارے بزرگوں نے محنت، جدوجہد اور عظیم قربانیوں کے بعد پاکستان حاصل کیا۔ اب وطن کی بقاء، ترقی اور خوشحالی کے لیے نئی نسل کو اپنا بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا۔

اِس موقع پر اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان گلگت یار اللہ فیصل نے یومِ آزادی کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور مہمانِ خصوصی سمیت مختلف اسکولوں سے آنے والے بچوں کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب کے اختتام پر بچوں میں انعامات تقسیم کیے گئے جبکہ ڈپٹی اسپیکر ملک کفایت الرحمان کو ریڈیو پاکستان گلگت کی جانب سے یادگاری سوینئر بھی پیش کیا گیا۔

تقریب میں بچوں کی بھرپور شرکت نے یومِ آزادی کی خوشیوں کو مزید دوبالا کر دیا اور قومی یکجہتی، حبُ الوطنی اور نئی نسل کے عزم کا خوبصورت اظہار کیا۔





محترمہ خان بی بی کا ریڈیو پاکستان گلگت کا تفصیلی دورہ، ادارے کی کارکردگی کا جائزہ



رپورٹ: ڈاکٹر شیر دل خان



ریڈیو پاکستان کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی معزز رکن محترمہ خان بی بی نے ریڈیو پاکستان گلگت کا تفصیلی دورہ کیا۔ دورے کے دوران اُنہیں ریڈیو پاکستان گلگت کی مجموعی کارکردگی، مختلف شعبہ جات کی پیشہ ورانہ سرگرمیوں، نشریاتی نظام اور عوام تک معلومات، تعلیم، آگہی اور تفریحی پروگراموں کی فراہمی کے حوالے سے تفصیلی بریفنگ دی گئی۔

ریڈیو پاکستان گلگت پہنچنے پر محترمہ خان بی بی کا اسٹیشن ڈائریکٹر یاراللہ فیصل اور عملے نے استقبال کیا اور پھولوں کا گلدستہ پیش کیا۔اِس کے بعد ادارے کے مختلف شعبہ جات کا دورہ کرایا گیا۔اِس موقع پر شعبۂ پروگرام، انجینئرنگ اور اکاؤنٹس کے افسران و ذمہ داران نے اپنے اپنے شعبہ جات کی کارکردگی، ذمہ داریوں اور درپیش امور کے بارے میں تفصیلی بریفنگ دی۔

محترمہ خان بی بی کو ریڈیو پاکستان گلگت سے نشر ہونے والے مختلف پروگراموں کے بارے میں بھی آگاہ کیا گیا۔اُنہیں بتایا گیا کہ ریڈیو پاکستان گلگت گلگت بلتستان کے مختلف علاقوں کے عوام تک قومی، علاقائی، سماجی، ثقافتی، تعلیمی اور معلوماتی مواد پہنچانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ مقامی زبانوں اور ثقافت کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ عوامی مسائل، قومی امور، صحت، تعلیم، خواتین، نوجوانوں، سیاحت اور دیگر اہم موضوعات کو بھی پروگراموں کا حصہ بنایا جاتا ہے۔

دورے کے دوران انجینئرنگ شعبے کی جانب سے ریڈیو پاکستان گلگت کے مختلف نشریاتی ذرائع اور اُن کی کوریج کے حوالے سے بھی تفصیلی بریفنگ دی گئی۔ محترمہ خان بی بی کو صوت القرآن چینل، ایف ایم 93 اور میڈیم ویو ٹرانسمیٹر کی تکنیکی صورتحال، نشریاتی دائرہ کار اور مختلف علاقوں تک پروگراموں کی رسائی کے بارے میں آگاہ کیا گیا۔اِس موقع پر نشریات کے معیار کو بہتر بنانے اور جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے کے حوالے سے مختلف امور پر بھی تبادلۂ خیال کیا گیا۔

اکاؤنٹس شعبے کی جانب سے ادارے کے مالی معاملات، بجٹ، اخراجات اور دیگر انتظامی امور کے بارے میں بھی بریفنگ دی گئی۔ محترمہ خان بی بی نے مختلف شعبہ جات کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے افسران اور عملے سے گفتگو کی اور اُن کے پیشہ ورانہ امور اور مسائل کے بارے میں بھی معلومات حاصل کیں۔

اِس موقع پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے محترمہ خان بی بی نے کہا کہ ریڈیو پاکستان گلگت دُور دراز اور دشوار گزار علاقوں میں رہنے والے عوام تک معلومات، تعلیم اور آگہی پہنچانے کا ایک آسان، مؤثر اور قابلِ اعتماد ذریعہ ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ گلگت بلتستان جیسے جغرافیائی اعتبار سے وسیع اور دشوار گزار خطے میں ریڈیو کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے، کیونکہ یہ کم وسائل میں بھی عوام کے ایک بڑے طبقے تک بروقت معلومات اور مفید پروگرام پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

محترمہ خان بی بی نے کہا کہ بدلتے ہوئے دُور کے تقاضوں کے پیشِ نظر ریڈیو پاکستان جیسے اہم قومی نشریاتی ادارے کو جدید ٹیکنالوجی، ڈیجیٹل میڈیا اور سوشل میڈیا کے نئے ذرائع سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اپنی رسائی اور اثر پذیری کو مزید بڑھانا ہوگا۔ اُنہوں نے اِس امر پر زور دیا کہ روایتی ریڈیو نشریات کے ساتھ ساتھ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز کو بھی مؤثر انداز میں استعمال کیا جائے تاکہ بالخصوص نوجوان نسل کو ریڈیو پاکستان کے پروگراموں سے مزید قریب لایا جاسکے۔

اُنہوں نے کہا کہ ریڈیو پاکستان گلگت کو گلگت بلتستان کی مقامی زبانوں، ثقافت، روایات، موسیقی اور معاشرتی اقدار کے فروغ کے لیے اپنا کردار مزید مؤثر انداز میں جاری رکھنا چاہیے۔ مقامی مسائل اور عوامی ضروریات کو پروگراموں کا حصہ بنا کر ریڈیو کو عوامی رابطے کا مزید مضبوط ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔

محترمہ خان بی بی نے ریڈیو پاکستان گلگت کے افسران اور عملے کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ محدود وسائل کے باوجود ادارے سے وابستہ افراد قومی نشریاتی ذمہ داریوں کو احسن انداز میں انجام دے رہے ہیں۔ اُنہوں نے اُمید ظاہر کی کہ ریڈیو پاکستان گلگت مستقبل میں بھی جدید تقاضوں سے ہم آہنگ نشریات پیش کرتے ہوئے گلگت بلتستان کے عوام کی معلومات، تعلیم، آگہی اور تفریح کی ضروریات پوری کرنے میں اپنا مؤثر کردار ادا کرتا رہے گا۔

دورے کے اختتام پر محترمہ خان بی بی نے ریڈیو پاکستان گلگت کی تاریخی اور قومی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہوئے اِس عزم کا اظہار کیا کہ ادارے کو جدید خطوط پر مزید فعال اور مؤثر بنانے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔



ریڈیو پاکستان فیصل آباد کا 44 سالہ نشریاتی سفر

تحریر: ثنا ریاض



فیصل آباد میں ریڈیو پاکستان کا افتتاح 15 ستمبر 1982ء کو اُس وقت کے وزیر برائے اطلاعات و نشریات جناب راجہ ظفر الحق نے کیا جب کہ 93 FM کی نشریات میں شمولیت نومبر 2010ء میں ہوئی۔ مانچسٹر آف پاکستان فیصل آباد میں ریڈیو پاکستان کے تین اسٹیشنز FM 101,FM 93.4 FM 93 (صوتُ القرآن) عوامی خدمت میں مصروفِ عمل ہیں۔ FM-101 فیصل آباد کا افتتاح 16 مارچ، 2002ء کو اُس وقت کے گورنر پنجاب خالد مقبول نے کیا۔ FM 93.4 (صوتُ القرآن) چینل کی نشریات کا آغاز 6 جون، 2016ء کو ہوا جس کا افتتاح وفاقی وزیر برائے ترقی اور منصوبہ بندی جناب احسن اقبال نے کیا۔ اِس قومی نشریاتی ادارے سے وابستہ افراد عوامی خدمت کے جذبے سے سرشار ہیں۔

ریڈیو پاکستان فیصل آباد کی نشریاتی زون کی بات کی جائے تو اِس میں قریبی اضلاع چنیوٹ، جھنگ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ شامل ہیں۔

ریڈیو پاکستان فیصل آباد کے پروگرام سامعین کی دلچسپی اور آراء کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ترتیب دیے جاتے ہیں۔ ربیع الاول، محرم الحرام، عیدین، رمضان المبارک اور جشنِ آزادی کے علاوہ دیگر اہم دنوں میں اِسی خاص مناسبت سے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جن میں خصوصی فیچر، ڈرامے، غنائیے اور موسیقی کے پروگرام شامل ہیں۔ ملکی ثقافت کو اُجاگر کرنے کے لئے مختلف پروگراموں میں ملک کے نامور فنکار حصہ لیتے رہے ہیں۔ اِن میں عالمی شہرت یافتہ موسیقی کے اُستاد فتح علی قوال (مرحوم)، نصرت فتح علی خان (مرحوم)، اعجاز قیصر (مرحوم) راحت فتح علی خان، مہر علی شیر علی، حبیب رفیق قوال، لوک فنکار محمد صادق فیصل آبادی اور کئی دوسرے نام شامل ہیں۔

ریڈیو پاکستان فیصل آباد کی نشریات کے مختلف پروگراموں میں انتظامیہ کے عہدیداران، ممبرانِ قومی اور صوبائی اسمبلی بھی شامل ہوتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے تحت منائے جانے والے بین الاقوامی ایام پر بھی متعلقہ دن کے حوالے سے مہمان مدعو کیے جاتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان فیصل آباد کے مقبول پروگراموں میں "راوی تے چناں، حالاتِ حاضرہ پر مبنی پروگرام رابطہ، دینی تعلیمات کا پروگرام الہدیٰ اور زرعی پروگرام "ساندل دھرتی" شامل ہیں۔

ریڈیو پاکستان کے قومی نشریاتی رابطے پر بھی ریڈیو پاکستان فیصل آباد کی اپنے پروگراموں کے ذریعے خاطر خواہ نمائندگی ہے۔

ریڈیو پاکستان فیصل آباد کی نشریات ویب سٹریمنگ، فیس بک اور ٹویٹر پر بھی سُن اور دیکھ سکتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان فیصل آباد شہریوں کی آگاہی کے لیے صحت، تعلیم، شجر کاری، سماجی رویوں اور ماحول کو بہتر بنانے کے حوالے سے Content کا پروگرامز میں اہتمام کرتا ہے تاکہ تفریح کے ساتھ ساتھ تعمیر کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ فیصل آباد ڈویژن کے شہری ریڈیو پاکستان فیصل آباد سے اپنی دِلی وابستگی کا اظہار اپنی فون کالز، خطوط، فیس بک اور وٹس ایپ میسج جز کے ذریعے کرتے ہیں اور اُن کی آراء کی روشنی میں پروگرامنگ کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اطلاعات، تعلیم اور تفریح کے مشن کو بخوبی نبھاتے ہوئے ریڈیو پاکستان فیصل آباد کا 44 سالہ پُروقار سفر کامیابی سے جاری ہے۔

شعبہ میڈیا اینڈ کمیونیکیشن اسٹڈیز اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے طلباء و طالبات کا مطالعاتی دورہ اور تربیتی سیشن کا انعقاد

رپورٹ: فیض رسول ہاشمی





ریڈیو پاکستان بہاول پور میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبہ میڈیا اینڈ کمیونی کیشن اسٹڈیز کے طلباء و طالبات کے لیے مطالعاتی دورے کے ساتھ خصوصی تربیتی سیشن کا انعقاد کیا گیا۔ دورے کا مقصد طلبہ کو ریڈیو براڈکاسٹنگ کے عملی تقاضوں، جدید ابلاغی ذرائع اور پیشہ ورانہ میڈیا ورکنگ سے روشناس کرانا تھا۔اِس موقع پر طلباء و طالبات نے میڈیم ویو اسٹوڈیو، ایف ایم 101 بہاول پور، پوڈکاسٹ اسٹوڈیو، ماسٹر کنٹرول روم، نیوز سیکشن، فوٹو گیلری اور دیگر نشریاتی شعبہ جات کا دورہ کیا اور پروگراموں کی تیاری و نشریات کے مختلف مراحل کا مشاہدہ کیا۔اُنہیں ریڈیو پاکستان بہاول پور کی نشریاتی خدمات، پروگرامنگ اور جدید براڈکاسٹنگ کے تقاضوں کے بارے بریفنگ بھی دی گئی۔ تربیتی سیشن سے اسٹیشن ڈائریکٹر سجاد احمد بری، چیئرمین شعبہ میڈیا اینڈ کمیونی کیشن اسٹڈیز پروفیسر ڈاکٹر ملک عدنان اور سابق چیئرمین ڈاکٹر محمد شہزاد رانا نے اظہارِ خیال کیا۔

مقررین نے کہا کہ ریڈیو پاکستان بہاول پور اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کے شعبہ میڈیا اینڈ اسٹڈیز کے درمیان باہمی تعاون اور عملی اشتراک کو مزید فروغ دیا جائے گا تاکہ طلباء کو تعلیمی علم کے ساتھ عملی میڈیا تربیت کے بہتر مواقع میسر آسکیں۔اُنہوں نے انٹرن شپ اور مشترکہ سرگرمیوں کے ذریعے اکیڈمیا اور میڈیا انڈسٹری کے درمیان روابط مضبوط بنانے پر بھی زور دیا۔

اِس موقع پر شعبہ ہذا کے اساتذہ ڈاکٹر رضا ماجد، ڈاکٹر حنان خان ترین، ڈاکٹر قمر زمان، ڈاکٹر ہما شمس اور ڈاکٹر غلام مرتضیٰ بھی موجود تھے۔ طلباء و طالبات نے اپنے تاثرات میں کہا کہ ریڈیو پاکستان بہاول پور کا مطالعاتی دورہ اُن کے لیے ایک مفید اور یادگار تجربہ ہے، جس سے اُنہیں براڈکاسٹنگ، پروگرام پروڈکشن اور جدید میڈیا کے عملی پہلوؤں کو قریب سے سمجھنے کا موقع ملا۔





اسپورٹس

انیس الرحمان انیس الرحمان



انگلینڈ سے سیریز میں شکست، ویسٹ انڈیز سے برابر

دورۂ انگلینڈ میں پاکستان لیڈز اور لارڈز کے پہلے دو ٹیسٹ میچوں میں ناکامی کے بعد سیریز بھی ہار گیا۔ 19 سے 21 اگست تک ہیڈنگلے لیڈز میں انگلینڈ نے ٹاس جیت کر پہلے پاکستان کو بیٹنگ کی دعوت دی۔ فاسٹ بولرز اولی رابنسن اور جوش ٹنگ کی شاندار باؤلنگ کے باعث پاکستان کی ٹیم 48.1 اوورز میں صرف 71 رنز پر آؤٹ ہوگئی۔ عبداللہ شفیق 61 اور امام الحق 42 رنز کے ساتھ نمایاں رہے۔ بابر اعظم مکمل فٹ نہ ہونے کے باعث یہ میچ نہیں کھیلے۔ قیادت سلیمان آغا نے کی۔ جوش ٹنگ نے 46 اور اولی رابنسن نے 51 رنز کے عوض 5,5 وکٹیں حاصل کیں۔ جواب میں انگلینڈ نے 89.5 اوورز میں 409 رنز بنا کر 238 رنز کی برتری حاصل کی۔ چار کھلاڑیوں نے نصف سینچریاں اسکور کیں۔ ہیری بروک نے 91، جورڈن کوکس نے 73، جو روٹ نے 66 اور ڈین لارنس نے 51 رنز بنائے۔ لیفٹ آرم اسپنر علی عثمان نے 95 رنز کے عوض پانچ وکٹیں حاصل کیں۔ پاکستانی بیٹنگ دوسری اننگز میں بھی ناکام رہی اور صرف 37.3 اوورز میں 135 رنز پر پویلین لوٹ گئی۔ محمد رضوان نے 41 اور شان مسعود نے 29 رنز بنائے۔ اولی رابنسن، جوش ٹنگ اور جوفر آرچر نے تین تین وکٹیں حاصل کیں۔ یوں انگلینڈ کی ٹیم پہلے ٹیسٹ میں 103 رنز سے فتح یاب رہی۔ اولی رابنسن مین آف دی میچ رہے۔ دوسرا ٹیسٹ 27 سے 30 اگست تک لارڈز میں کھیلا گیا جس میں پاکستان کو 16 برس کے بعد شکست ہوئی۔ انگلینڈ کی کامیابی 194 رنز کی تھی۔ پاکستان نے ٹاس جیت کر انگلینڈ کو بیٹنگ کی دعوت دی۔ 120 رنز پر پانچ وکٹیں گرنے کے باوجود انگلش ٹیم 290 رنز بنانے میں کامیاب رہی جس میں جیمی اسمتھ کے 61، جورڈن کوکس کے 55 رنز نمایاں تھے۔ محمد عباس نے 4 اور محمد علی نے 3 کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا۔ جواب میں پاکستان کی اننگز 37.2 اوورز میں محض 110 رنز پر سمٹ گئی جس میں اذان اویس کے 46 رنز نمایاں تھے۔ آٹھ کھلاڑی دوہرے اعداد تک بھی نہ پہنچ سکے۔ انگلینڈ نے دوسری اننگز میں 208 رنز اسکور کر کے پاکستان کو 388 رنز کا ہدف دیا لیکن پاکستان کی پوری ٹیم 50.5 اوورز میں 194 رنز پر آل آؤٹ ہوگئی۔ سعود شکیل نے 97 رنز کی عمدہ اننگ کھیلی۔ محمد عباس نے انگلینڈ کی دوسری اننگز میں 57 رنز کے عوض پانچ وکٹیں حاصل کر کے لارڈز کے اونرز بورڈ پر اپنا نام درج کرایا۔ اُنہوں نے میچ میں 130 رنز دے کر نو وکٹیں حاصل کیں۔ یوں انگلینڈ نے 194 سے کامیابی حاصل کر کے سیریز جیت لی۔ تیسرا اور آخری ٹیسٹ 9 سے 13 ستمبر تک برمنگھم میں شیڈیول ہے۔ لارڈز ٹیسٹ میں شکست کے بعد پاکستان کرکٹ بورڈ نے سات کھلاڑیوں جن میں دونوں اننگز میں بیٹنگ نہ کرنے والے امام الحق کے علاوہ محمد رضوان، خرم شہزاد، علی عثمان، عامر جمال، سلیمان علی آغا اور اویس ظفر کے علاوہ ہیڈ کوچ سرفراز احمد اور باؤلنگ کوچ عمر گل کو پاکستان واپس بلا لیا اور اُن کی جگہ عبداللہ فضل، صائم ایوب، سعید بیگ، عمران رمدھاوا، عمران جونیئر، رضا اللہ اور عرفات منہاس کو تیسرے ٹیسٹ کے لیے برمنگھم بھیجا ہے۔ مائیک ہسن اور اشلے نوفلے ہیڈ کوچ اور باؤلنگ کوچ کے فرائض انجام دیں گے۔ اِس سے قبل پاکستان کرکٹ ٹیم نے اپنے دورۂ ویسٹ انڈیز کا اختتام دوسرے ٹیسٹ میں آٹھ وکٹوں کی فتح کے ساتھ کیا۔ کوائنز پارک اوول پورٹ آف اسپین میں دوسے پانچ اگست تک کھیلے گئے اِس میچ میں ویسٹ انڈیز نے پہلے بیٹنگ کرتے ہوئے 344 رنز بنائے۔ جواب میں پاکستان نے 387 رنز بنا کر 43 رنز کی برتری حاصل کی۔ عبداللہ شفیق نے 160 ناٹ آؤٹ اور بابر اعظم نے 88 رنز بنائے۔ ویسٹ انڈیز کی ٹیم دوسری اننگز میں صرف 117 رنز پر آؤٹ ہوگئی۔ علی عثمان اور ساجد خان نے چار چار وکٹیں حاصل کیں۔ پاکستان نے مطلوبہ 75 رنز دو وکٹوں پر بنا لیے۔



ہاکی ورلڈ کپ میں پاکستان کی گیارہویں پوزیشن

نیدرلینڈ اور بیل میں کھیلے گئے ورلڈ کپ ہاکی ٹورنامنٹ میں پاکستان نے 16 ٹیموں کے ٹورنامنٹ میں گیارہویں پوزیشن حاصل کی۔ فائنل میں جرمنی نے اسپین کو ایک صفر سے ہرا کر مسلسل دوسری اور مجموعی طور پر چوتھی مرتبہ ورلڈ کپ جیت کر پاکستان کا ریکارڈ برابر کر دیا۔ ارجنٹائن نے تیسری اور میزبان نیدرلینڈ نے چوتھی پوزیشن حاصل کی۔ پاکستان کو گروپ کے پہلے میچ میں انگلینڈ سے چار ایک سے شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرا میچ ویلز سے تین تین گول سے برابر رہا جبکہ بھارت کے خلاف آخری گروپ میچ میں پاکستان کو پانچ تین سے شکست ہوئی۔ پول جی میں جاپان سے ہارنے کے بعد پاکستانی ٹیم نیوزی لینڈ سے چار دو سے ہاری جس کے بعد اِس نے جنوبی افریقہ کو پوزیشن میچ میں پینلٹی پر چار تین سے شکست دی۔

ایران کے خلاف کبڈی سیریز میں شکست

اسلام آباد میں پاکستان اور ایران کی ٹیموں کے درمیان پانچ میچوں کی کبڈی سیریز میں ایران کی ٹیم نے پانچ صفر سے کامیابی حاصل کی۔

بشکریہ پی بی سی کراچی

بچوں کا آہنگ

میں پاکستان ہوں

تحریر: ریحانہ کوثر سلہری



میرے ننھے دوستو!

میں پاکستان ہوں۔۔۔ تم میرے ہو۔۔۔ میں تمہارا ہوں۔۔۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔۔۔ مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔

پھر۔۔۔ مجھ سے اتنی دوری کیوں۔۔۔؟

تمہاری عمر بارہ چودہ سال ہے۔ میری عمر اٹھاون سال ہے۔ تم نے میری آغوش میں پرورش پائی ہے۔ میں نے تمہارے آباؤاجداد کی شب و روز محنت سے پرورش پائی ہے۔ بہت سے لوگوں کی خواہش تھی میں ٹوٹ جاؤں..... میرا نام و نشان تک صفحۂ ہستی سے مٹ جائے مگر دشمن کی تمام چالیں ناکام ہو گئیں۔۔۔ میری آغوش میں پلنے والے میرے بہادر جوانوں نے دشمن کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔۔۔!

مجھے یقین ہے کہ تم بھی بہادر سپاہی بنو گے۔ تم میرے محافظ بنو گے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے فرائض سے غفلت برت رہے ہو۔۔۔

تم نے کتابوں کو چھوڑ کر بھارتی فلموں سے دوستی کر لی ہے۔۔۔ اپنے اسکول کی کتابیں تم سے پڑھنا مشکل ہو گئی ہیں۔ میں سوچتا ہوں۔۔۔ مجھ سے اتنی دوری کیوں۔۔۔؟

میں جانتا ہوں۔۔۔

تم دل میں مجھ سے للکار کو پوچھ رہے ہو گے کہ ہم تو اپنے فرض کو بھول کر صرف اپنے آپ سے دُور ہوئے ہیں۔ تو پھر تمہیں اِس سے مطلب۔۔۔؟

میرے پیارے بچو!

میں نے تو پہلے بھی کہا ہے کہ۔۔۔ تم میرے ہو۔۔۔ میں تمہارا ہوں۔۔

تم نے اپنے فرض کو چھوڑ کر خود کو ہی نہ چھوڑا۔۔۔ بلکہ میرے مان، میرے دل کو بھی توڑا ہے۔

اگر تم اپنے اسلاف کے کارناموں کو جان جاتے۔۔۔ اپنے مجاہدوں کی تاریخ کو پڑھتے تو تمہیں احساس ہوتا میری آغوش تمہارے لیے کتنی بڑی نعمت ہے۔۔۔!

اِس نعمت کے بارے میں کسی غریبُ الوطن سے پوچھنا۔۔۔!

اِس نعمت کے بارے میں اُن سے پوچھو جو میرے لیے اپنی جانوں کو قربان کر گئے۔ انسانی خون کی ندیوں نے مجھے سیراب کیا تو میں معرضِ وجود میں آیا۔۔۔ اگر تم بھی میرے محافظ اور نگران بن جا وٗ تو کوئی میرا بال بیکا نہیں کر سکتا۔۔۔!

مگر تمہیں اِس سے کیا۔۔۔؟

تم اپنے بیکار کاموں میں مشغول رہو۔۔۔ دشمن مجھے کینہ توز نظروں سے گھورتا ہے تو گھورتا رہے۔

میرے پیارے پھول سے بچو! میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔۔۔؟ کبھی تم نے سوچا۔ میں نہ ہوں تو تمہارا کیا ہے؟؟؟ تمہیں میرے اوپر مان ہونا چاہیے۔ مگر تم میری بنائی ہوئی چیزیں پسند نہ کرتے ہو۔۔۔ تم غیروں کی عطا کی ہوئی چیزوں کو شوق سے قبول کر لیتے ہو۔۔۔ تم اپنے گھر سے کوڑا کرکٹ اُٹھا کر میری گلیوں اور بازاروں میں پھینک دیتے ہو۔۔۔!

اب تم سوچو گے کہ یہ کام تو ہمارے بڑے کرتے ہیں۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ تم اپنے فرض کو پہچانو! اپنا گھر صاف کرو تو اپنی گلی بھی صاف کرو۔ اپنے تعلیمی ادارے کو کبھی گندہ نہ کرو جو تمہارے اُستاد تمہیں سکھاتے ہیں اُسے دل لگا کر سیکھو۔۔۔ پڑھ لکھ کر خوب نام کماؤ۔ تم شاید نہیں جانتے کہ تم نام کماؤ گے تو میری عزت خود بخود بڑھ جائے گی! تم یہ نہ سوچو کہ ابھی تو میں چھوٹا ہوں۔۔۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ بلکہ میدانِ عمل میں کود پڑو۔۔۔ میری خاطر۔۔۔ اپنے ماں باپ کی خاطر، اپنے اچھے مستقبل کی خاطر۔۔۔ کوئی بھی کام کرتے وقت دوسروں پر احسان نہ کرو۔۔۔ بلکہ خوشدلی اور لگن سے کام انجام دو۔۔۔ اپنا سکول، گلی۔۔۔ محلہ اور گھر خود صاف رکھو تاکہ تم وبائی امراض سے محفوظ رہ سکو!!

اگر تم اپنے فرض کو ادا کرو گے تو میرے تمہارے درمیان حائل دوری خود بخود ختم ہو جائے گی۔

میں تم سے ناأمید نہیں ہوں۔۔۔ تم میں ضرور کوئی محمد علی جناحؒ اور علامہ محمد اقبالؒ بنے گا!!

میرے ننھے بچو!

میں تمہارا پاکستان ہوں۔۔۔

تم میرے ہو۔۔۔

میں تمہارا ہوں۔۔۔

تمہیں مجھ سے محبت ہے۔۔۔

مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔

اب خیال رکھنا۔۔۔

تم مجھ سے دُور نہ رہنا۔۔۔!

میں پاکستان ہوں۔۔۔

میں تمہارا پاکستان ہوں۔۔۔!!

ستمبر کے اہم دن

۱	ریڈیو پاکستان راولپنڈی کی سالگرہ	۱۸	مریضوں کے تحفظ کا عالمی دن
۲	یومِ وفات احمد راہی، شاعر	۱۹	یومِ وفات اُستاد امانت علی خان
۳	یومِ وفات عابد علی، اداکار	۲۰	ریڈیو پاکستان مٹھی کی سالگرہ
۴	یومِ دفاعِ پاکستان	۲۱	یومِ وفات میر تقی میر، شاعر
۵	یومِ فضائیہ	۲۲	عالمی یومِ امن
۶	یومِ وفات اشفاق احمد، ادیب/دانشور	۲۳	یومِ وفات طفیل نیازی، لوک گلوکار
۷	یومِ وفات ڈاکٹر وزیر آغا، شاعر/نقاد	۲۴	یومِ وفات سید محمد مہدی (رئیس امروہی)، شاعر
۸	یومِ بحریہ	۲۵	ریڈیو پاکستان لاڑکانہ کی سالگرہ
۹	خواندگی کا عالمی دن	۲۶	سمندری تجارت (Maritime) کا عالمی دن
۱۰	یومِ وفات اکبر الہ آبادی، شاعر	۲۷	یومِ وفات ڈاکٹر محمود احمد غازی، مذہبی اسکالر
۱۱	یومِ وفات اختر شیرانی، شاعر	۲۸	سیاحت کا عالمی دن
۱۲	یومِ وفات بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح	۲۹	یومِ وفات منیر حسین، گلوکار
۱۳	یومِ شہادت میجر عزیز بھٹی شہید نشانِ حیدر	۳۰	اطلاعات تک رسائی کا عالمی دن
۱۴	ابتدائی طبّی امداد (First Aid) کا عالمی دن	۳۱	یومِ وفات نسیم بیگم، گلوکارہ
۱۵	عالمی یومِ جمہوریت	۳۲	آزاد کشمیر ریڈیو، میر پور کی سالگرہ
۱۶	ریڈیو پاکستان فیصل آباد کی سالگرہ		
۱۷	اوزون کی تہہ کی حفاظت سے متعلق آگاہی کا عالمی دن		